آنکھیں ترستیاں ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

پبلشنگ ہاؤس
ارکیٹ ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آنکھیں ترستیاں ہیں

آنکھیں ترستیاں ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
9-گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی 110002

پہلی بار : فروری ۱۹۸۱ء
قیمت : چھتیس روپے =/36
کتابت : رحمت علی خاں رام پوری
مطبع : نعمانی پریس - دہلی

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس - ۹ گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اپنے محبوب دوست

مخدوم محی الدین مرحوم

کے نام

"رفتی و من دیدنِ تو آرزو دارم ہنوز"

ترتیب

حرفِ اوّل

یہ مختصر سی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میری یادوں کی داستان کا ایک ورق ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ میری داستانِ حیات کا ایک ورق ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اِس داستان میں جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے، ان کے ساتھ میرا تعلق خاطر ایک سا نہ تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا لیکن ان سب نے میری زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور کیا ہے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی میرے استاد تھے۔ ظاہر ہے کہ اس فہرست میں والدِ محترم کے بعد اگر کسی شخصیت کا زیادہ سے زیادہ اثر میری طبیعت اور میرے مزاج نے قبول کیا ہے تو وہ مولانا کی شخصیت ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میرے بزرگ بھی تھے اور میرے دوست بھی۔ میں اِن حضرات کا ادب بھی ملحوظ رکھتا تھا اور اِن کے ساتھ میری بے تکلفی بھی تھی۔ ان کے ساتھ میری بے اندازہ ملاقاتیں رہیں اور میں نے اِن سے بے اندازہ فیض حاصل کیا۔

مولانا عبدالمجید سالک کے لیے اِن کے بعد کی نسل کے دلوں میں صرف عزت اور احترام ہی کے جذبات نہیں ہیں بلکہ محبت اور عقیدت کی بھی فراوانی ہے۔ سالک صاحب نے اپنی تحریروں سے، اپنی گفتار سے اور اپنے اخبار سے، پوری ایک نسل کی ذہنی

پرورش کی ہے۔ اِن کی خدمت میں میری حاضری ہمیشہ نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ رہی۔ اور یہ حاضری میرے قیامِ لاہور کی داستان کا ایک تابندہ ورق ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم اے میں میرے استاد تھے۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں ان کے ساتھ آخری ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک نہیں کئی۔ اقبال عالمی کانگریس کی تقریب کے دوران میں اور فروری ۱۹۷۸ء میں ان کے انتقالِ پُرملال کی اطلاع ملی۔ یہ چند سطور جو اس کتاب میں شامل ہیں ان کی یادیں بے ساختہ زبانِ قلم پر آگئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں میری حاضری ایک بہت بڑے عالم کے حضور میں ایک نیازمند کی حاضری تھی۔ مولانا کے علم و فضل سے میں متاثر بھی رہا اور مرعوب بھی۔ ان کے سامنے میں نے ہمیشہ بولنے کو سننے پر ترجیح دی اور یہ تاثر شریکِ اشاعت مقالے میں بھی جھلک رہا ہے۔

سروجنی نائیڈو کے ساتھ صرف ایک ہی بار ملاقات ہوئی اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ ان کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس پر یہ مصرع صادق آتا ہے ع

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

پروفیسر عبدالقادر سروری کے ساتھ ملاقاتوں کی داستان بہت طویل ہے جو کچھ میں نے ان کے بارے میں لکھا ہے اس سے کہیں زیادہ لکھنے کی آرزو ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کے یہاں دہلی اور کراچی دونوں جگہوں پر مجھے طویل قیام کے موقعے ملے۔ انھیں میں نے بہت قریب سے دیکھا اور قریب سے دیکھنے کے باوجود ان کی عظمت میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

بنّے بھائی کی محبوب شخصیت کے بارے میں کیا کہا جائے۔ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ آج بھی یادوں کی ایک متاعِ عزیز ہے۔

درگا پرساد دھر میری زندگی میں پہلے تو ایک ان دیکھے محبوب کی طرح رہے جب اس کے بعد قربت کی منزل آئی تو وہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے روپوش ہو گئے۔

مہندر ناتھ اور سلیمان اریب میرے عزیز دوست تھے۔ یہ دونوں مقابلتاً کم عمری ہی میں اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ ان کی موت میرے لیے سنگ آمد و سخت آمد والا معاملہ تھا۔

جاں نثار اختر اور کرشن چندر صرف میرے بے تکلف دوست ہی نہیں تھے بلکہ میری زندگی میں مینارِ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج نور کے یہ مینار بجھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود میرے جادۂ حیات کو منوّر کر رہے ہیں۔

یہ مقالات (دو ایک کو چھوڑ کے) جو ان تمام حضرات کی موت کے بعد میں نے لکھے ایک طرح سے اپنی زندگی کے اُس خلا کو پُر کرنے کی کوشش ہیں جو میری بزم سے ان عزیز دوستوں اور بزرگوں کے یکے بعد دیگرے اُٹھ جانے سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

آج جب کہ یہ کتاب مطبع میں چھپنے کے لیے جا رہی ہے۔ یہ تمام شخصیتیں میری نظر کے سامنے موجود ہیں اور زبان پر یہ شعر آ رہا ہے:

اے ہمنفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

(۲)

اِس مجموعے کا مقالہ "کرشن چندر کی یاد میں" دراصل مقالہ نہیں ہے بلکہ میری زیرِ تکمیل سوانح حیات کے اقتباسات پر مشتمل ایک تحریر ہے۔

میری سوانح حیات کے وہ حصے جن میں کرشن چندر کا ذکر موجود ہے۔ کرشن کی زندگی ہی میں لکھے گئے تھے۔ آج جب کہ کرشن ہم میں نہیں ہیں۔ میں کرشن کی یاد میں ان اقتباسات کو یکجا کر کے زیرِ نظر کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔

مقالہ "جاں نثار اختر" بھی جاں نثار اختر کی زندگی میں لکھا گیا اور پہلے اور دوسرے حصے پر مشتمل یہ مقالہ "فن اور شخصیت" کے جاں نثار اختر نمبر میں شائع ہوا۔ اس کا تیسرا حصہ دراصل میری تحریر نہیں بلکہ دو یا تین منٹ کی ایک تقریر ہے جو جاں نثار اختر کے انتقال کے فوراً بعد میں نے مرنے والے دوست کو خراجِ عقیدت کے طور پر ریڈیو کشمیر سری نگر سے نشر کی۔ یہ تقریر نشر ہونے کے بعد ٹیپ سے کاغذ پر منتقل کی گئی۔

"محروم ـــــ میرے والد" کا ابتدائی حصہ بھی اُن کی زندگی میں لکھا گیا اور ایک مکمل مقالے کی صورت میں "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا۔ اس کا آخری حصہ والدِ محترم کے انتقال کے بعد میں نے ماہنامہ "صبح" دہلی کے لیے لکھا۔ اس وقت یہ سارا مقالہ اوّل سے آخر تک خاصی ترمیم اور اضافے کے ساتھ زیرِ نظر کتاب

میں شامل کیا جا رہا ہے۔

(۳)

مذکورہ بالا بائیس چھوٹے بڑے مقالات میں سے چند ایک پر مشتمل یہ مسودہ ۱۹۷۷ء میں مکمل ہو گیا تھا لیکن اسے مرتب اور صاف کرنے کی فرصت مجھے نہ مل سکی۔ وقت گزرتا گیا اور اس مجموعے میں تین مقالوں (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، حسرت موہانی اور عرش ملسیانی) اور تین چھوٹے چھوٹے بعد از مرگ نثری خراجہائے عقیدت کا اضافہ ہوا۔ رشید احمد صدیقی پریم ناتھ در، نریش کمار شاد۔

مولانا حسرت موہانی پر مقالہ حسرت مرحوم کے جشن صد سالہ کے موقع پر لکھا گیا جو کچھ مدت ہوئی کان پور میں منایا گیا تھا۔ میں اہلِ کان پور کا ممنون ہوں کہ ان کی فرمائش پر میں نے حسرت موہانی کے بارے میں اپنی ان یادوں کو یکجا کر لیا جو مدت سے میرے حافظے کے نہاں خانے میں موجود تھیں۔ اب اس مقالہ کو دیکھتا ہوں تو میں اس دور کے لاہور میں پہنچ جاتا ہوں جس میں میرے ذوقِ ادب، ذوقِ شعر گوئی اور ذوقِ شعر فہمی کی تربیت ہوئی اور آج جو ماضی کی دھند میں لپٹا ہوا ہونے کے باوجود میرے ذہن اور وجدان کے افق پر مہر تاباں کی تجلی برسا رہا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی پر مجھے ایک مکمل مقالہ لکھنا چاہیے تھا۔ اُن کا ادب میں مقام اور ان کے ساتھ قربت دونوں اِس امر کی متقاضی تھیں لیکن خواہش کے باوجود یہ قرض ادا کرنے کے لیے وقت نہ مل سکا۔ ان کے انتقالِ پُرملال کی اطلاع بھی مجھے اِس طرح ملی کہ ایک دن میں اپنے دفتر پریس انفارمیشن بیورو دہلی میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک ریڈیو کے پروڈیوسر شجاع سلطان ٹیپ ریکارڈر لیے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور بولے رشید احمد صدیقی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں ان سے پوچھتا کب انتقال ہوا، بیمار تو تھے نہیں ہوا کیا کہ انھوں نے فوراً ہی کہا "ابھی چند منٹ میں تعزیتی پیغامات نشر ہونا ہیں آپ اپنے تاثرات فوراً ریکارڈ کرا دیجیے"۔ میں نے شدتِ غم کے عالم میں تعمیلِ ارشاد کی۔ دوسرے دن وہ میرے تاثرات ٹیپ ریکارڈر سے نقل کر کے لے آئے۔ اس کے بعد ان تاثرات کو پورے مضمون کی صورت میں پھیلانے کی مہلت نہ ملی۔ قریب قریب

ایسی ہی صورت پریم ناتھ درؔ کی موت کے وقت پیدا ہوئی۔

نریش کمار شادؔ پر بھی چند سطور قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں۔ نریش کمار شادؔ میرے عزیز دوست تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے اور میں ان کے متعلق ایک طویل مقالے کا مقروض ہوں۔

گزشتہ برس عرشؔ ملسیانی کا انتقال ہوا۔ ان کی یاد میں میری تحریر پینتیس چھتیس برس کی دوستی اور رفاقت کی طویل داستان سناتی ہے۔ عرشؔ سے ذرا آگے پیچھے میرے جو احباب اور بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ان میں یوسف حسین خاں، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عبدالعلیم، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر احتشام حسین، کنہیا لال کپور، سہیل عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، ابن انشا، رضیہ سجاد ظہیر، پنڈت ہری چند اختر، ماہر القادری، سراج الدین ظفر اور بسمل سعیدی، مجھے اس وقت بہت یاد آ رہے ہیں۔ جن پر میں ابھی تک کچھ نہیں لکھ سکا۔ بشرطِ زندگی مجھے ان سب پر لکھنا ہے۔ لمحاتِ فرصت کے انتظار میں ہوں، اور اب تو میں خود اس مقام تک پہنچ گیا ہوں کہ بہت جلد میرے دوستوں کو میری یاد میں قلم اٹھانا پڑے گا۔

(۴)

اس مجموعے کی اشاعت نہ جانے ابھی کب تک معرضِ التوا میں رہتی کہ عزیز محترم پریم گوپال متل نے آج آل انڈیا اردو کانفرنس کے موقع پر چنڈی گڑھ میں مجھ سے اس کا ذکر کیا اور مجھ سے کہا کہ مسودہ مرتب کر کے انھیں بھیج دیا جائے۔ دراصل کتاب کی طباعت کے رستے میں سب سے مشکل منزل یہی ہوتی ہے۔ مسودے کو صاف کرنا اور اسے مرتب کرنا۔ نہ جانے میں مسودہ مرتب کرنے کے لیے ابھی کتنی مہلت اور مانگتا کہ میرے عزیز شاگرد چوہدری وزیر حسین ہجرآن ایم اے اناؤنسر ریڈیو جموں نے یہ سارا کام اپنے ذمے لے کر مجھے بار بار مہلت مانگنے سے بچا لیا اور اس مسودے کو صاف کر کے اور اسے مرتب کر کے اس قابل بنا دیا کہ میں یہ عزیزم پریم گوپال متل کی خدمت میں روانہ کر دوں۔ چنانچہ وزیر حسین ہجرآن کی یہ محنت آج ہی پریم گوپال متل کو بھیج کے اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں، جو مجھے آج سے بہت پہلے ادا کر دینا چاہیئے تھا۔

جگن ناتھ آزاد

شعبۂ اردو
جموں یونی ورسٹی جموں
۴ر ستمبر ۱۹۸۰ء

مقدمہ

شخصیت نگاری کا جائزہ لینے پر اندازِ نظر اور تدبیر کاری کے لحاظ سے اب واضح طور پر دو دھارے
کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف وضع داری پر مبنی انداز جس کی اساس مشرقی رواداری پر استوار
ہے۔ اس میں قلم کی وراداری کی روشنائی میں ڈبو کر اور آنکھوں پر عقیدت و احترام کی عینک لگا کر شخصیت
کا خوش منظر رخ دکھایا جاتا ہے۔ ہماری سوانح عمریاں اور شخصیت نگاری کی بیش تر مثالیں اسی
شریفانہ انداز کی مظہر قرار دی جا سکتی ہیں اور اسی اندازِ شخصیت نگاری کے خلاف سعادت حسن منٹو
نے ان الفاظ میں احتجاج کیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا شخصیت کو لانڈری سے دھلا لیا گیا
ہو۔ چنانچہ منٹو اور عصمت چغتائی جیسے باغی ادیبوں کی تحریروں سے اس انداز کی داغ بیل پڑی جس
میں شخصیت پر لانڈری میں کلف چڑھانے کی بجائے اس کے داغ داغ دامن اور تار تار گریبان
کے ذریعے منفی سے مثبت کا تاثر ابھارا جاتا ہے۔ ویسے یہ انداز بے حد خطرناک کہ نفسیاتی علم آگہی اور
کردار کے لاشعوری محرکات سے عدم واقفیت کے باعث اس نوع کی شخصیت نگاری سنسنی خیزی کے
باوجود گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ شاید اس لیے اب بھی بیش تر لکھنے والے اولین رجحان کے ترجمان
نظر آتے ہیں۔

شخصیت نگاری کے تجزیاتی مطالعہ سے بیش تر خود شخصیت نگار کی جانچ بھی بہت
ضروری ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ شخصیت نگار کی اپنی نفسیات اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے
مخصوص رجحانات و میلانات ذاتی پسند و ناپسند اور پالتو تعصبات اس کی آنکھوں پر جو غیر
مرئی عینک چڑھا دیتے ہیں اس کے باعث وہ ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہی کے مطابق افراد اور

وقوعات کی پرکھ کرتا ہے۔ اس لیے اگر "حیاتِ جاوید" حالی کے برعکس شبلی یا اکبر الہ آبادی نے لکھی ہوتی تو کیا وہ "مدلل مداحی" ہو سکتی تھی؟ اسی طرح اگر مولوی عبدالحق کے برعکس کسی اور نے "چند ہم عصر" لکھی ہوتی تو اس میں پنج ذات کے نام دیو مالی اور ایک گم نام سپاہی نور خاں پر مضامین کبھی بھی نہ ملتے۔

اگرچہ بیش تر شخصیت نگاروں نے اپنے معیارِ شخصیت کی بطورِ خاص تصریح نہ کی لیکن موضوع بننے والی شخصیات اور پھر ان کی تصویر کشی میں روا رکھے گئے انداز سے ان کے اپنے مخصوص تصورِ شخصیت نگاری کا استخراج کوئی ایسا مشکل کام نہیں اور اس انداز پر اگر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری کا جائزہ لیں تو "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں شامل بائیس ۲۲ شخصیات پر قلم بند کیے گئے مضامین سے ان کے مخصوص تصورِ شخصیت نگاری کا با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد تلوک چند محروم کے صاحب زادے ہیں اور یہاں مجھے یہ امر بطورِ خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہئیے کہ یہ دونوں نامور باپ بیٹے دنیائے ادب میں اتنے ہی ممتاز اور منفرد ہیں جتنا کہ اپنے غیر متعصبانہ رویے، شریف النفسی اور وسیع ظرفی کے لیے مشہور ہیں۔ شاید اسی لیے انھوں نے فسادات کی آگ میں مسلمان دوستوں اور مسلمان محلوں میں پناہ لینے کو ترجیح دی۔

ان ایام کی داستان بہ زبانِ آزاد:

"۱۹۴۷ء کے ذکر سے یاد آیا میرا لاہور چھوڑنے کا پروگرام بہت جلدی میں ہوا تھا۔ اس قدر جلد لاہور چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں تھا بلکہ ارادہ تو وہیں مستقل قیام کا تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا وہ سارا ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل تھا۔ یہ کرشن نگر سے ملحقہ رام نگر کا علاقہ تھا۔ فسادات کے دنوں میں یہ علاقہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ ہم چند لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم اپنا گھر بار اور اپنا وطن چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ لیکن ہر نئی صبح اس آبادی کی ایک خاصی تعداد کے ارادے کے متزلزل ہونے کی خبر لاتی تھی۔ اپنے اپنے گھروں میں جمے رہنے کا مستقل ارادہ کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز کمی ہوتی گئی اور ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ اس ساٹھ ہزار کی آبادی میں میرے سوا کوئی ہندو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سب جا چکے ہیں۔ اسی عالم میں چودہ اگست کی رات کو میں نے لاہور ریڈیو سے اپنا ترانہ "پاکستان" سنا۔

اے سرزمینِ پاک!

ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک

روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً یہ پہلا ترانۂ پاکستان تھا جو پاکستان کے نقشۂ عالم پر نمودار ہونے کے ساتھ ہی یعنی ۱۴ اگست کو رات کے بارہ بجے سننے والوں تک پہنچا۔" (صلاح الدین احمد)

اور جب بالآخر گھر بار چھوڑا تو یہ عالم تھا کہ "عین اس دن جب سالک صاحب کے خیال کے مطابق مجھے کسی خالص ہندو آبادی میں محفوظ ہونا چاہیئے تھا۔ میں ملتان روڈ پر ابو ظفر نازش رضوی کے مکان پر مقیم تھا اور وہاں کی خالص مسلم آبادی کے مہمانِ عزیز کی طرح فروکش تھا۔" (عبدالمجید سالک)

اور جب بچ بچا کر دہلی پہنچ گئے تو لاہور کی ایسی یاد ستائی کہ پھر واپس آگئے۔ آزاد تو پاکستان ہی میں رہنے کے خواہش مند تھے مگر بعض بہی خواہوں کے مشورے پر واپس "شرنارتھی" بن کر جانے پر مجبور ہو گئے۔

اور پھر جب پاکستان آئے تو یوں :

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں (عبدالقادر سروری)

اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ محروم کے فرزند ہیں جو خود اسلام کا شیدائی تھا ورنہ ایسے اشعار نہ لکھتا :

اے ملتِ اسلام! ترے ذوقِ سخن سے — فردوسِ نظر عالمِ معنی کا ہے گلزار
تبریزی و رومی کی نواؤں سے ہے پیہم — وہ حسن کی بارش کہ ہے جاں مطلعِ انوار
ہے روحِ بشر اس کے تجسس میں ازل سے — جس حسن کے ہیں پردہ کشا جامی و عطار

محروم نے کس حد تک اسلامی شعار اپنا رکھے تھے اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کی دو سالہ بیٹی کا انتقال ہوا تو بقول آزاد "اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنایا گیا تھا۔ والد اور میں مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے۔" (محروم میرے والد)

میرا مقصد جگن ناتھ آزاد کو اسلام شاہ آزاد ثابت کرنا نہیں صرف اس امر کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ آزاد اور ان کے والد محترم کس قدر غیر متعصب انسان تھے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں انھوں نے جن ہستیوں کو عقیدت و محبت اور خلوص سے یاد کیا ہے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مگر کیسے کیسے مسلمان کہ ایک شاعری میں ان کا استاد ہے (تاجور نجیب آبادی) تو دوسرا فارسی کا پروفیسر ہے (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم) جبکہ ایک اردو دنیائے ادب میں ان کی راہبری کرتا ہے (مولانا صلاح الدین احمد) اس طرح زندگی کے دیگر مواقع میں بھی جن جن حضرات نے کسی نہ کسی طرح ان کی دستگیری کی ان سب کا بصد احترام اعتراف کیا ہے۔ اس

لیے ان مضامین کو پڑھ کر آزاد کی شخصیت کی جو تصویر مرتب ہوتی ہے۔ اس میں محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کی انکساری کا رنگ بھی ملتا ہے۔ بلکہ آزاد کی شخصیت کا یہ پہلو اتنا نمایاں ہے کہ پہلی ملاقات ہی میں اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح بزرگوں اور بالخصوص اساتذہ کے احترام کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مثلاً وہ مشاعروں میں ہمیشہ اپنے استاد تاجور نجیب آبادی کے پیچھے بیٹھتے تھے (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم) اس مضمون میں وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں اقبال عالمی کانگریس کے موقعے پر سیالکوٹ میں مندوبین کا جو جلوس نکلا اس کی قیادت کا اعزاز انھیں سونپا گیا۔ مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ جلوس میں ان کے دو اساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم بھی تھے اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے اساتذہ کی قیادت کریں۔ آخر جب خود صوفی صاحب نے زور دے کر کہا تو وہ مانے۔ اس طرح جب سیالکوٹ ہی میں مشاعرے کی صدارت کے لیے بھی ان ہی کا نام تجویز ہوا تو انھوں نے پھر اساتذہ کے احترام میں صدارت سے جان چھڑانی چاہی اس پر بھی صوفی صاحب نے ڈانٹا یوں کہ بقول آزاد "مجھے ان کا چالیس برس پہلے والا لہجہ یاد آیا جب انھوں نے کلاس روم میں مجھ سے کہا تھا

"AZAD! GET OUT OF THE CLASS ROOM."

ان مضامین سے آزاد کی علامہ اقبال سے محبت اور عقیدت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ آج جگن ناتھ آزاد نے اقبال سکالر کے لحاظ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ ہمارے ہاں وہ عدیم المثال مقبولیت رکھتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کو اقبال شناسی بھی اپنے نامور والد سے ورثے میں ملی ہے۔ چنانچہ اپنے والد پر لکھے گئے مضمون میں وہ بتاتے ہیں کہ علامہ کے انتقال پر کیسے ان کے والد نے فی البدیہہ نظم کہی۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا　　احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

اس مضمون سے یہ اہم انکشاف بھی ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے سبقاً سبقاً عروض پڑھی تھی۔ ان مضامین میں کئی ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جن سے علامہ اقبال سے عقیدت کی شدت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ "آج میری بیاض اقبال کی ان نظموں اور غزلوں سے مملو ہیں جو اقبال کی مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں۔" (عبدالمجید سالک) کبھی اظہارِ تعزیت کے لیے اقبال کے اشعار سے مرہم کا کام لیتے ہیں (عبدالمجید سالک) تو کبھی اپنی "کم مائگی" کے احساس کی ترجمانی کے لئے اقبال کا

شعر نقل کرتے ہیں (ابوالکلام آزاد) یہی نہیں بلکہ اقبالؔ کے خلاف بات تک سننے کے روادار نہیں ہیں۔
("سلیمان اریب") اور جب کوئی ان کی توقع کے برعکس اقبالؔ کا شیدائی نہ نکلے تو "چہرہ پر انقباض کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔" (کرشن چندر) شاید اسی لیے جگن ناتھ آزاد نے اپنی زندگی علامہ اقبالؔ کی تعلیمات کے فروغ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ جب میں اپنی مرتبہ کتاب "اقبالیات کے نقوش" کے لیے علامہ اقبالؔ کی زندگی میں ان پر لکھے گئے مقالات کی تلاش میں پرانے جرائد کی خاک چھان رہا تھا تو مئی ۱۹۳۸ء کے "ہمایوں" میں جگن ناتھ آزاد کا ایک مقالہ بعنوان "اقبال کی منظر نگاری" میرے ہاتھ لگا۔ میں کیونکہ اب تک آزاد سے نہ ملا تھا۔ اس لیے سوچا یہ بھی یقیناً کوئی معمر اقبال شناس ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کے زمانۂ طالب علمی کی کوشش تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک آزاد نے خود کو علامہ اقبالؔ کے لیے وقف کیے رکھا ہے۔ اس لحاظ سے تو یہ حضرت واقعی یک رخے ذہن (SINGLE TRACK OF MIND) کے حامل ہیں اور یہ "ٹریک" ہے۔ اقبال!

جگن ناتھ آزاد کی علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت کے نتیجے میں مختلف شخصیات کے مطالعات میں علامہ اقبال کے بارے میں بعض نئی اور کام کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شیخ عبدالقادر کا یہ انکشاف کہ ان کے "بانگِ درا" کے دیباچے کے بارے میں بعض احباب نے " اقبال کو یہ رائے دی تھی کہ یہ دیباچہ "بانگ درا" میں شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ "بانگِ درا" کے معیار کا نہیں ہے لیکن اقبالؔ نے یہ دیباچہ "بانگِ درا" میں شامل کیا اور اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھوں نے اسے پسند کیا ہوگا۔ شیخ صاحب نے کہا " یہ بات خود اقبالؔ نے مجھے بتائی تھی۔ اگرچہ ان لوگوں میں سے کسی کا نام نہیں بتایا جنھوں نے دیباچے کے بارے میں مخالفانہ رائے دی تھی۔"

اقبال کے بعض ایسے غیر مطبوعہ اشعار بھی لکھے گئے ہیں جو مدت بعد کہیں جا کر مدون ہوئے۔ تین اشعار پیش ہیں:

شبِ فرقت تصور تھا ترا اعجاز تھا کیا تھا ۔۔۔ تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

مجھے اقبال اس سید[1] کے گھر سے فیض پہنچا ہے ۔۔۔ پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

---

[1] غالباً اپنے فارسی کے استاد مولوی میر حسن کی طرف اشارہ ہے۔

دلم سوخت، تنم سوخت، استخواں ہم سوخت تمام سوختم وذوقِ سوختن باقیست

شیخ عبدالقادر والے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی نظموں کے پہلے مجموعے کا نام "اقبال" تھا اور اس میں تمام نظمیں اقبال ہی کے بارے میں تھیں۔ بعض نظموں میں اقبال کے مصرعوں یا اشعار کی تضمین تھی "یہ مسودہ تو ۱۹۴۷ء میں تلف ہو گیا لیکن شیخ عبدالقادر نے اس پر جو دیباچہ لکھا وہ محفوظ رہ گیا اور اب حمیدہ سلطان احمد کی مرتبہ کتاب "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" میں شامل ہے۔"

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اقبال شناسی جگن ناتھ آزاد کی تخلیقی شخصیت میں اساسی کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ جب میں نے اپنی کتاب "فکرِ اقبال کا تعارف" کا انتساب جگن ناتھ آزاد کے نام کیا تو میں اس سے بہتر لکھنے کو اور کچھ نہ سوچ سکا۔

"اقبال کے غیر متعصب سکالر اور مداح جگن ناتھ آزاد کے نام"

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازاں باں قسمت کہ پیشِ یار می رقصم

"آنکھیں ترستیاں ہیں" کے بائیس سوانحی مضامین دراصل وہ آئینے ہیں جن میں آزاد نے اپنی فطرت کے بہترین عناصر کی امداد سے اپنے دوستوں اور بزرگوں کی یادوں کے محبت بھرے مرقعے سجائے ہیں۔ یوں دیکھیں تو یہ تمام مضامین مل کر "موزیک" کی صورت اختیار کر کے خود جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کے رنگ دکھاتے ہیں۔ وہ شخصیت جس کا سارا حسن اور رنگینی، محبت، خلوصِ جذبات، لگن اور عجز و انکسار سے جنم لیتا ہے۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے!

ڈاکٹر سلیم اختر

تاجور نجیب آبادی

شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی میرے استاد تھے۔ اسکول یا کالج یا یونی ورسٹی میں نہیں بلکہ ادبیات میں۔ مجھے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں اُن سے اصلاح لینے کا شرف حاصل ہوا۔

استاد اور شاگردی کے اس رشتے کی ابتدا آج سے سینتیس سال پہلے ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں بات یہ ہوئی کہ میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرکے ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور آیا لیکن ایسا ہوا کہ ایم۔ اے میں داخلے کو تو میں بھول گیا اور شعر و ادب کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی میرا مقدر بن گیا۔ یہی کوچہ گردی مجھے ایک دن مولانا تاجور نجیب آبادی کے دولت خانہ پر لے گئی۔ اُن دنوں وہ ترنگ میں مقیم تھے۔

دراصل میں وہاں تنہا نہیں پہنچا تھا۔ مولانا تاجور کے ایک ہونہار شاگرد کرپال سنگھ بیدار کے ساتھ گیا تھا۔ گوپال متل وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ بیدار نے مولانا سے میرا تعارف کرایا۔ "مولانا! یہ جگن ناتھ آزاد ہیں، محروم صاحب کے فرزند ہیں، شعر بھی کہتے ہیں، نثر بھی لکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک غزل "زمانہ" کان پور میں چھپی ہے۔ "ہمایوں" میں ان کا ایک مقالہ "اقبال کی منظر نگاری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ "ادبی دنیا" میں بھی نقل ہوا ہے ——————" کرپال سنگھ بیدار نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ مولانا نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے میرے سارے کردار کا جائزہ لے رہے ہوں اور

مجھے ایسا گمان ہوا کہ میری غزل یا مقالے کے بارے میں، انھیں بیدار کی بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔ انھوں نے جواب میں کچھ کہا بھی جو میں اس وقت نہیں سمجھا۔ دو ایک روز بعد گوپال متل نے مجھ سے پوچھا ——— ”تم نے سنا تھا مولانا نے کیا کہا تھا؟“ میں نے کہا سُنا تو تھا لیکن سمجھا نہیں“ گوپال متل نے کہا اُس فقرے کے معنی یہ تھے کہ تم خود کیا شعر کہتے ہو گے اپنے والد کا کلام اپنے نام سے چھپواتے ہو گے۔“ اور مولانا کا فقرہ کا یہ تھا ——— ”اب محرّم صاحب کو شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔“

اِسی ملاقات کی بات ہے گوپال متل تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کے باہر گئے۔ میں ابھی تک خاموش بیٹھا تھا۔ اب مولانا میری طرف متوجہ ہوئے۔ کہنے لگے لاہور کس سلسلے میں آئے ہو؟ میں نے کہا کالج میں داخل ہونے کے لیے۔

”تو داخلہ لے لیا؟“

”جی ابھی نہیں“

”کیوں؟“

”سوچ رہا ہوں کہ انگریزی میں داخلہ لوں یا فارسی میں“

مولانا بولے

”کیوں فارسی میں داخلہ لے کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ گارڈن کالج سے بی۔ اے کر کے آئے ہو اس کی آبرو رکھو۔ گورنمنٹ کالج یا فارمن کرسچین میں داخلہ لے لو اور انگریزی میں ایم۔ اے کرو۔ ان دونوں کالجوں میں داخلہ ہے تو مشکل لیکن ایچ۔ ایل اوگیرٹ مجھے ملتے ہیں۔ میں ان سے کہوں گا تو تمھیں داخلہ مل جائے گا۔ تم نے بتایا ہے کہ ڈویژن تمھاری اچھی ہے۔ مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

لیکن حالات کی بات ہے میں اس وقت نہ انگریزی میں داخلہ لے سکا نہ فارسی میں۔ لاہور کی سڑکیں اور ادبی محفلیں میرے لیے زنجیر پا بن گئیں۔

بہر طور کرپال سنگھ بیدار نے میری طرف سے بات کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا ”مولانا! آزاد کی بڑی خواہش ہے کہ یہ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو۔ آپ اسے اپنی شاگردی میں قبول کر لیجیے“۔ مولانا بولے ”ہم گویا اپنے دشمنوں میں ایک اور اضافہ کر لوں“ میں اس جواب سے چکرا گیا۔ اور اس وقت بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

یہ مولانا کی خدمت میں میری پہلی حاضری تھی

اس کے بعد میں تنہا مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگے تمھارے والد اور حفیظ جالندھری گہرے دوست ہیں۔ حفیظ میرے مخالفوں میں ہے۔ تم میرے شاگرد بنو گے تو نہ اِدھر کے رہو گے نہ اُدھر کے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ بھی تو میرے والد کے دوست ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ حفیظ صاحب اور آپ کی باہمی مخالفت میں میں آپ میں سے ایک کا مخالف بن کے رہوں۔ فرمانے لگے تمھاری مرضی، لیکن بات بنے گی نہیں۔

مجھے اس وقت مولانا اور حفیظ صاحب کی باہمی مخالفت کا پورا علم نہیں تھا اور اگرچہ میں اُس وقت بچہ نہیں تھا۔ اٹھارہ برس کی میری عمر تھی لیکن اسے اب اپنی حماقت کے سوا اور کس بات پر محمول کروں کہ اتنی سی بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ مولانا کا میں شاگرد بن رہا تھا اور اس بات سے خالی الذہن رہا کہ حفیظ صاحب کے لیے میرے دل میں کتنی ہی عزت کیوں نہ ہو اور ان کا کلام مجھے کتنا ہی پسند کیوں نہ ہو، جب مولانا اور حفیظ صاحب کے درمیان بات بڑھے گی تو میں اپنے استاد کے خلاف نہ جا سکوں گا۔

(۲)

مولانا کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس حلقے میں وہ شعراء بھی تھے جنھوں نے شاعری میں بہت اونچا مقام حاصل کیا۔ مثلاً اختر شیرانی اور احسان دانش۔ وہ لوگ بھی تھے جو اپنے وقت میں بہت چمکے لیکن ع ''خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود'' کے مصداق تھوڑی مدت بعد ادبی افق سے قریب قریب اوجھل ہو گئے۔ یہ فہرست بہت طویل ہے اور اس میں بعض نام تو آج بھی دنیائے ادب میں باقی ہیں۔ لیکن زیادہ تر فراموش ہو چکے ہیں۔

اس وقت مولانا کے شاگردوں کی فہرست گنوانا میرا مقصد بھی نہیں اور تمام نام مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں ایک بات کی طرف ضرور اشارہ کرنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ مولانا کے ہندو شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پنجاب میں بلکہ سارے ہندوستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے بارے میں مولانا مرحوم کا ایک خاص نظریہ تھا۔ اور وہ یہ کہ جب تک اردو ہندوؤں میں مقبول نہیں ہو گی اس کا کوئی مستقبل نہیں اور ہندوؤں میں اردو کو مقبول بنانے کے لیے مولانا نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

بد قسمتی سے یہ وہ دور تھا کہ بعض مسلّمہ حیثیت کے مسلمان حامیانِ اردو اپنے اِس

نظریے پر سختی سے قائم تھے کہ ہندوؤں کو اُردو نہیں آتی ۔ مجھے یاد نہیں آرہا کہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار روزنامہ "زمیندار" میں میرے والد کے علاوہ کسی غیر مسلم اردو شاعر کا کلام شائع ہوا ہو۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی زمانے میں یہ اشعار بھی کہے تھے :

ہیں وہ ہندو شعرا دشمنِ جانِ اُردو — میٹنا چاہتے ہیں نام و نشانِ اردو
فارسی سے انھیں ضد ہے کہ جو ہے روحِ ادب — عربی سے انھیں کد ہے ہے جو جانِ اُردو
ٹاٹ ہندی کا بنارس میں الٹ کر جھکی — آریہ ورت کی منڈی میں دکانِ اُردو
گرچہ گن ہندی کا گاتے ہیں ملاپ اور پرتاپ — جس سے چاندی ہوئی ان کی وہ ہے کانِ اردو

اس کا جواب مولانا ظفر علی خاں کے استاد بھائی پنڈت راج نارائن ارمان دہلوی نے ان اشعار میں دیا تھا :

ہیں وہ مسلم شعرا دشمنِ جانِ اردو — جو مٹانے کو ہیں تیار نشانِ اُردو
جو مٹانے کی جگہ میٹنا لکھ جاتے ہیں — روئے گی ان کی اس اردو پہ زبانِ اُردو
دور اُردوئے معلا کرم آباد سے ہے — ہم سے آئے گی جب آئے گی زبانِ اُردو

اس ایک مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں پنجاب کی ادبی فضا کس قدر گرد آلود تھی ۔ مولانا تاجور مرحوم کا دامن اس گرد سے ہمیشہ پاک رہا اور اُردو کو ہندوؤں میں ہر دل عزیز بنانے کے لیے انھوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔

(۳)

مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ۔ وہ ایک کثیر الجہت شخصیت تھے ۔ اس وقت جب میں ان کے بارے میں بات چیت کر رہا ہوں، اُن کی زندگی کے مختلف گوشے ایک فلم کی طرح میری نظر کے سامنے رواں دواں ہیں اور میں حیران ہوں کہ ان کی بھرپور شخصیت کے کس کس پہلو کا ذکر کروں ۔ اُن کی علمیت، اُن کی زبان دانی، ان کی اصلاحِ سخن، اصلاحِ نثر، اُن کا طنز و مزاح، اُن کی کردار نگاری، شاعری، بدیہہ گوئی، نثر نگاری، مکاتیب —— ان تمام باتوں کے مختصر ذکر کے لیے بھی دفتر درکار ہیں یہ وہ کہانی نہیں کہ باتوں باتوں میں سنا دی جائے ۔

اُردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی ۔ اس کی خدمت کے لیے انھوں نے اُردو مرکز قائم

کیا۔ "ادبی دنیا"، کی بنیاد ڈالی۔ یہ جہازی سائز کے چھیانوے صفحات پر اردو کا یہ ماہنامہ شائع ہوتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں "نیرنگِ خیال" کا طوطی بول رہا تھا لیکن "ادبی دنیا" "نیرنگِ خیال"، سے بھی کچھ آگے ہی نکل گیا۔ "ادبی دنیا"، کے بعد آپ نے "شاہکار"، جاری کیا۔ بچوں کے لیے ہفتہ وار "پریم"، نکالا، جس کے سرورق پر بھارت ماتا کی رنگین تصویر کے اوپر یہ اشعار لکھے رہتے تھے:

بھارت ماتا سب کی مائی	سب ہندی ہیں بھائی بھائی
من میں بہائیں پریم کی گنگا	ہندو مسلم سکھ عیسائی

شروع شروع میں جب میں نے اپنی نظم اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں پیش کی تو دیکھ کے کہنے لگے کہ سوچا انگریزی میں اور لکھا اردو میں؟ ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا۔ میں نے اپنی نظم پر دوبارہ غور کیا تو احساس ہوا کہ اکثر ترکیبیں اور بندشیں انگریزی بندشوں کے چربے تھے۔

ان کا اصلاح دینے کا طریقہ یہ تھا کہ مصرعے کو کاٹ کے اس کی جگہ اپنا مصرعہ نہیں چپکا دیتے تھے بلکہ اس کا عیب بیان کر کے کہتے تھے کہ اب یہ مصرعہ خود دوبارہ کہو اور اس طرح سے کہ یہ عیب اس میں نہ رہے یا یہ خوبی اس میں پیدا ہو جائے۔ نظم کے ایک ایک مصرعے پر بھی بحث کرتے تھے اور بحیثیتِ مجموعی ساری نظم پر بھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اختر شیرانی اور احسان دانش کے کلام میں ان کی اصلاح کا کیا طریقہ تھا لیکن جہاں تک میرے کلام کا تعلق ہے مذکورہ طریقہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ مجھ سے چند ہی روز کے بعد فرمانے لگے کہ تمھیں کلامِ اقبال زبانی یاد ہے۔ تم میرے لیے "بالِ جبریل"، لے کے آؤ، میں تمھیں اقبال کے معائب اور محاسن سے آشنا کروں گا۔ ان کا مقصد مجھے بنیادی طور پر بلند پایہ شاعری کے محاسن اور معائب سے آشنا کرنا تھا۔ اس ضمن میں اقبال سے بہتر مثال اور کیا مل سکتی تھی۔ چنانچہ "بالِ جبریل"، میں نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھی۔

اِس درس و تدریس کے دوران میں اقبال کا شعر سامنے آیا:

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

فرمایا "پرہیز" مذکر ہے۔ اِسے مؤنث کبھی نہ باندھنا۔ اِسی طرح :

مدّت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر !
کردے اِسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند

پر بھی کہا کہ "غار" مذکر ہے۔ اقبالؔ نے صحیح نہیں لکھا۔

اِس رباعی پر :

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے	کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی	اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

فرمانے لگے کہ جان کا مرنا نہ لغت کی رو سے صحیح ہے، نہ روزمرہ کی رو سے اور نہ محاورے کی رو سے۔
جان کے ساتھ "جانا" کا لفظ ہونا چاہئے۔ جان جاتی ہے، مرتی نہیں۔

مقامِ رنگ و بو کا راز پاجا

پر کہنے لگے کہ یہ "پاجا" مذاقِ سلیم پر گراں گزر رہا ہے۔ یہی بات اس شعر میں "دیر پیوندی"
کی ترکیب پر کہی :

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

بولے تم اس مفہوم کو بیان کرو تو "دیر آمیزی" کہنا۔ دیر پیوندی نہ کہنا۔

ایک دن کلامِ اقبالؔ کے اسی طرح کے معائب کا ذکر کرتے ہوئے ایک نہایت
ہی معنی خیز جملہ ان کے منہ سے نکلا جو مجھے قریب قریب انہی کے الفاظ میں یاد ہے۔ ارشاد
فرمایا :

"اقبالؔ کے سیلابِ شعر و سیلابِ فکر و معانی میں یہ خامیاں خس و
خاشاک کی طرح بہ جائیں گی۔ تمھارے کلام میں ہوں گی تو ہر وقت
سطح پر تیرتی رہیں گی اور دیکھنے والوں کی نظریں انھی کی طرف
اٹھیں گی۔"

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے مجھے صرف کلامِ اقبالؔ کی خامیوں سے آشنا کیا۔ یہ
تو سب کچھ میرے بیان و معانی کی اصلاح کے لیے تھا۔ دراصل انھوں نے کلامِ اقبالؔ کے
محاسن کو اس طرح میرے سامنے پیش کیا کہ میرے دل میں عشقِ اقبالؔ کی چنگاری شعلہ

بن کر بھڑک اٹھی۔

فیلمنگ روڈ والے مکان کی بات ہے۔ ایک دن فرمانے لگے، اقبال کی کوئی غزل اپنی لے میں مجھے سناؤ۔ مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے کہا آپ کے سامنے نہیں پڑھ سکتا۔ بولے جب اپنا کلام پڑھ سکتے ہو تو اقبال کا کلام کیوں نہیں پڑھ سکتے؟ میں نے عرض کیا اپنا کلام تو میں اصلاح کے لیے پیش کرتا ہوں۔ آپ کے سامنے کلام پڑھنے کی جرأت تو کبھی نہیں کی۔ بولے اور میری صدارت میں جب مشاعرہ پڑھتے ہو تو؟ مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔ میں نے غزل شروع کی ...:

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے

جب میں اس شعر پر پہنچا:

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا کی آنکھیں نم آلود ہو چکی ہیں۔

(۴)

درد و گداز کا یہ پیکر، شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کا بھی مرقع تھا۔ زبان کی بات تو خیر یہ تھی کہ باتیں کرتے تھے تو پھول جھڑتے تھے۔

علامہ ظریف کے قلمی نام سے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا ایک طویل سلسلہ آپ کے قلم کا رہونِ منت ہے۔ افسوس کہ ہم شاگردوں میں سے کسی کو یہ توفیق حاصل نہ ہو سکی کہ ان کی یہ تحریریں (یا ان کا کلام) مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کرا دیتا۔

مزاح نگاری کے بارے میں ایک دن فرمانے لگے کہ مزاح نگاری کا بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستہ، پھکڑ بازی اور دل آزاری کے عین درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔

نظم آزاد اور نظم معرّا کو مروج کرنے کے لیے انھوں نے صرف مضامین ہی نہیں لکھے بلکہ چھوٹی چھوٹی مثالیں دے دے کر ہم لوگوں کو نظم آزاد اور نظم معرّا کہنے پر آمادہ کیا۔

اس محبوب شخصیت کی باتیں تو قیامت تک ختم نہ ہوں گی۔ چاہتا ہوں کہ یہ مختصر سی بات چیت ان کے کلام پر ختم کروں۔ چند اشعار جو مجھے اس وقت یاد ہیں پیش کرتا ہوں:

دریا کی کہانی ساحل پر موجوں کی زبانی سنتا ہوں
ہر قطرے کے دل میں دریا کی ہے طغیانی سنتا ہوں

نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی، نہ وہ بدلے
میں کیوں کر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں
سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیسے رازداں کر لوں

سنگِ دل، تجھ پہ محبت کا اثر ہو کیوں کر
دل میں احساس ہوا کرتا ہے پتھر میں نہیں

حسن کو اپنے عروجِ بیکراں پر ناز ہے
خاکِ دل کا ذرہ ذرہ لامکاں پرواز ہے
سازِ دل پر گا رہا ہے یہ سکوتِ شب میں کون
کس بلا کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے
ہو رہا ہے محفلِ ہستی میں کس کا انتظار
کون آتا ہے کہ دنیا گوش بر آواز ہے

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دل داری "حسابِ دوستاں در دل" نہ بن جائے
ترے انوار سے ہے فیضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

نہ طوافِ کعبہ کا عزم کر نہ جبیں کو نذرِ صنم بنا
ترا دل ہے دیر و حرم اسی کو حریفِ دیر و حرم بنا

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے
خلشِ عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ہی مٹ جائے گا ایسا نظر آتا ہے مجھے
بُت کو بُت جان کے پوجوں تو میں کافر اے شیخ
بُت میں بُت ساز کا جلوہ نظر آتا ہے مجھے
کیا کہوں تجھ سے اب اے سوختۂ جلوۂ طور
دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے
دل کے پردے میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز
خلوتِ دل میں بھی پردہ نظر آتا ہے مجھے

ڈھونڈے گی کہاں تو مجھے اے خانہ خرابی
آوارہ وطن ہوں مری غربت مرا گھر ہے

خانہ بربادی کے ہاتھ آئی نہ میری بزمِ عیش　　　بجلیوں کو میرے خرمن کا پتہ ملتا نہیں

دل بھی دردِ دل کی صورت کر چکا ہے اختیار　　　کچھ نہیں سینے میں میرے ماسوائے دردِ دل
ہاں کوئی فولاد کا ٹکڑا ہے وہ اے تاجوَر　　　دل اگر پہلو میں ہے نا آشنائے دردِ دل

یہ ہیں اس محبوب شخصیت اور نابغۂ عصر کے چند اشعار جن کی یاد آج بھی آتی ہے تو دل کی کائنات آنسوؤں کا خراج عقیدت لے کر حاضر ہو جاتی ہے اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے :

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

۱۹۷۴ء

صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد کی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک ادارے کی موت ہے۔ ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ مولانا کی ذات روشنی کا ایک مینار تھی جس نے کتنے ہی نئے اذہان کو منور کیا۔ کتنے ہی ناآزمودہ کار مسافروں کی منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کی اور کتنے ہی ذروں کو چمکا کر انھیں آفتاب و ماہتاب کی تجلی عطا کی

آج مولانا صلاح الدین احمد کا خیال آتے ہی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چشمِ تصور کے سامنے آرہا ہے —— یادیں جو ۱۹۳۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۶۴ء تک پہنچ رہی ہیں —— ۱۹۳۷ء، جب کہ میں پہلی بار لاہور میں مولانا سے ملا تھا اور ۱۹۶۴ء جب کہ مجھے مولانا کا آخری خط ملا اور اس وقت اس خیال سے کہ مولانا کا یہ خط مجھے مارچ میں ملا تھا اور میں ابھی تک اس کی رسید بھی نہ دے سکا جو ندامت مجھے ہو رہی ہے اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ مولانا اپنے اس خط میں جو میرے پاس ان کی آخری یادگار ہے۔ لکھتے ہیں:

> والا نامہ ملا، میں جی رہا ہوں اور دوستوں ہی کی خاطر جی رہا ہوں۔ ورنہ اب جینے میں کیا رکھا ہے۔ جب سے والدۂ وجیہہ کا انتقال ہوا ہے زندگی بالکل ویران اور بے کیف ہو گئی ہے۔

جی ہاں میں ہوائی یونی ورسٹی کی دعوت پر ہونولولو گیا تھا۔ واپسی پر جاپان میں بھی کچھ دن گزارے اور اردو کے مشہور جاپانی فاضل پروفیسر

آرا گاٹو سے بھی خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ بہر حال آخر عمر کا یہ سفر ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوا۔

امید ہے کہ آپ اور قبلہ مخدوم صاحب بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ میرے پیچھے ڈاک کے پہاڑ جمع ہو گئے تھے۔ اب انھیں بتدریج دیکھ رہا ہوں۔ "کوہ مینا" مجھے نہیں ملی۔ جلد بھجوا دیجیے۔

ساڑھے تین سو چندوں کے اعلان کے بعد کچھ اور چندے بھی موصول ہوئے ہیں، جن میں تازہ ترین آپ کی جانب سے ہیں۔ آپ یہ رقم حافظ محمد عثمان صاحب گھڑی والے نزد ڈاک خانہ چاندنی چوک کو ادا کریں۔ اس کے مقابل پچاس پرچے ایک سال کے لیے ہندوستان ہی میں جاری کر دیے جائیں گے، اور تمام نام آپ کی خدمت میں ارسال ہوتے رہیں گے۔ آپ خود جن جن لوگوں کے نام جاری کروانا چاہیں ان کی ایک فہرست مجھے بھجوا دیجیے۔

وزیر آغا اور میں آپ کی اس ہمدردی و ہم نفسی کی تہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ جناب مخدوم صاحب کی خدمت میں سلام شوق۔

بچوں کو پیار

مخلص

صلاح الدین احمد

یہ مولانا کا ایک خط ہے۔ ان کے خطوط کے علاوہ ان کی نہ جانے کتنی یادگاریں میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی بات چیت، ان کا لب و لہجہ، ان کا خلوص، ان کی منکرانہ گفتگو، اُن کے قہقہے، ان کی تنقید، ان کے طنزیہ جملے، ان کی حوصلہ افزائی، ان کا پیار، ان کی محبت ——— اور ان کے ساتھ مال روڈ پر سال ہا سال پیدل سفر۔

۱۹۳۷ء ہی کی بات ہے، میں نے راولپنڈی سے اپنی ایک غزل اشاعت کے لیے "ادبی دنیا" کو اور ایک "زمانہ" کان پور کو بھیجی۔ اس سے قبل میرا کلام کبھی ادبی رسالے میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اور اس خیال سے کہ معلوم نہیں یہ غزلیں ان ماہناموں میں شائع ہوتی بھی ہیں یا نہیں۔ میں نے اپنے اس "جرأت آمیز" اقدام کا ذکر کسی دوست

سے نہ کیا۔ دوسرے ماہ مجھے لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ انارکلی کے چوک سے ایک آدھ دن کے بعد جو گزرا تو ایک بک اسٹال پر "ادبی دنیا" کا نیا شمارہ نظر پڑا۔ میں نے اس خیال سے کہ ممکن ہے میری غزل کو اس میں جگہ مل گئی ہو، اس کی ورق گردانی شروع کی۔ دیکھتا ہوں کہ میری غزل اس میں بڑے نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے۔

یہ مولانا کے کردار اور طرزِ عمل کا ایک مثالی پہلو تھا۔ نئے اور گمنام اہلِ قلم کو منظرِ عام پر لانا۔ آج ہندوستان اور پاکستان کے بعض بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیب اور شاعر اس بات کا اعتراف کریں یا نہ کریں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی ذہنی نشوونما اور ادبی تربیت، بلکہ ادبی تعمیر و ترقی میں مولانا کی توجہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

میری غزل چھپ گئی تو ایک شاعر کی حیثیت سے "ادبی دنیا" کے دفتر میں جا کر مولانا صلاح الدین احمد سے ملنے کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ چنانچہ اگلی صبح میں "ادبی دنیا" کے دفتر میں جا پہنچا۔ مولانا ابھی دفتر نہیں آئے تھے۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا۔ وہ آئے تو میں نے اپنا تعارف کرایا۔ انتہائی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ کہنے لگے آپ کی غزل نئے شمارے میں چھپ گئی ہے، آپ نے دیکھی؟ میں انجان بن گیا۔ نہ جانے کیوں۔ ممکن ہے میں نے یہ سوچا ہو کہ شاید اس صورت میں "ادبی دنیا" کا پرچہ مجھے نہ ملے یا ممکن ہے میرے چھٹ بھیئے پن نے مجھے دکھاوے کی بے نیازی پر اکسایا ہو۔ بہر طور میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ مولانا نے ملازم کو آواز دے کے پرچہ منگوایا۔ غزل مجھے دکھائی اور ہر اعتبار سے میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے ان کا فقرہ ابھی تک یاد ہے کہ جس زمین میں حسرت موہانی غزل کہہ چکے ہیں اس میں کامیاب غزل کہنا بڑی بات ہے۔

اس کے بعد راولپنڈی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ والدِ محترم اور علامہ صاحب کا ذکر انھوں نے خاص طور سے کیا۔ اور جب میں اجازت لے کر واپس آنے لگا تو انھوں نے کہا اب آپ لاہور آگئے ہیں تو امید ہے آپ سے ملاقات اکثر ہوتی رہے گی۔ یہ "ادبی دنیا" کے دفتر میں آنے کے لیے ایک صلائے عام تھی۔

میں وہاں سے چلا تو مارے خوشی کے میرے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے کوئی خزانہ مل گیا ہو اور واقعی میں نے ایک خزانہ پا لیا تھا، علم کا خزانہ، خلوص کا خزانہ۔

تھوڑی ہی مدت میں "ادبی دنیا" کا دفتر میرا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ میں اپنے دفتر سے فارغ ہوتے ہی سیدھا "ادبی دنیا" کے دفتر کا رخ کرتا تھا۔ مولانا وہاں ہوں یا نہ ہوں، میں گھنٹوں وہاں گزار دیتا تھا۔ مولانا کی میز پر نئی مطبوعات کا ہمیشہ انبار لگا رہتا تھا۔ اول تو دفتر میں میرا جی ہوتے تھے اگر وہ نہ ہوں تو ماہناموں اور کتابوں کی رفاقت ہر وقت حاصل تھی۔

یوں تو "ادبی دنیا" کا دفتر ہندوستان بھر کے شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک زیارت گاہ تھی۔ لیکن جو حضرات خاص طور پر اس زیارت گاہ سے متعلق تھے، ان میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، حفیظ ہوشیارپوری، قیوم نظر بادلی علیگ، کرشن چندر دیویندر ستیارتھی، راجندر سنگھ بیدی اور یوسف ظفر کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا کے قریب تر آنے کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی غزل یا نظم "ادبی دنیا" کے لیے دیتے ہوئے جھجک محسوس کرنے لگا۔ مجھے اکثر یہ ڈر رہتا تھا کہ میرا جو بھرم قائم ہوا ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ اب میری زیادہ تر توجہ "ادبی دنیا" کے اول سے آخر تک کے مطالعے پر مرکوز رہنے لگی۔ مولانا کے اداریے میں خاص طور سے بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتا تھا تاکہ ان کے زاویۂ نگاہ کا مجھے بخوبی علم ہوتا رہے۔ اس لیے کہ "ادبی دنیا" میں میرے کلام کا شائع ہوتے رہنا میری انتہائے آرزو تھی۔

اس محنت اور احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی نظر میں میرا ایک اعتبار قائم ہوا اور شاید قیوم نظر اور یوسف ظفر کے سوا بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ ۱۹۴۱ء میں مولانا جب اپنے کاروبار کے سلسلے میں چھ مہینے کے لیے بمبئی گئے تو اپنی غیر حاضری میں "ادبی دنیا" کی ادارت عملی طور پر میرے سپرد کر گئے۔ میری اس چھ مہینے کی کارکردگی سے مولانا بہت متاثر ہوئے۔ اور اس کا انھوں نے اکثر مجھ سے ذکر کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب کہ ابھی میرا لاہور چھوڑ کر دلی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو مولانا نے از خود مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو کبھی لاہور چھوڑنا پڑے تو ہندوستان میں آپ کو کہیں نہ کہیں ملازمت تلاش کرنا ہو گی۔ میں آپ کو ایک سرٹی فیکیٹ لکھ دیتا ہوں۔ شاید آپ کے کام آجائے۔ مولانا کا یہ سرٹی فیکیٹ جو اُن کے خلوص اور محبت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس وقت بھی حرزِ جاں کی طرح میرے پاس ہے۔ اس سرٹی فیکیٹ میں مولانا نے لکھا:

It gives me the greatest pleasure to certify that Jagan Nath Azad was always a support to me during

the last twelve years of my charge, as editor of the "Adabi Dunniya".

During my absence for six months from my office, in 1941 he practically replaced me and everything which a responsible editor of a great national magazine can possibly do, admirably well and to my entire satisfaction. He wields a forceful pen and is equally charming and impressive as a poet and as a writer of lucid Urdu prose. I wish him success wherever he goes.

یہ ۱۳ر فروری، ۱۹۴۷ء کا سرٹی فیکیٹ ہے۔ مجھے کبھی خیال ہی نہیں آسکتا تھا کہ مجھے اس سرٹی فیکیٹ کی اس وقت ضرورت ہو گی جب میں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں دہلی کی سڑکوں پر بھٹک رہا ہوں گا۔ آخر یہ سرٹی فیکیٹ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد اقبال، سید عابد علی عابدؔ اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ کے سرٹی فیکیٹوں کے ساتھ ہی میرے کام آیا اور ان سرٹی فیکیٹوں کے برابر ہی ان بزرگوں کی دعائیں کام آئیں۔ کیونکہ جب میں نے پبلی کیشنز ڈویژن میں شعبۂ اردو کے نائب مدیر کی جگہ کے لیے درخواست دی تو یہ تمام سرٹی فیکیٹ اپنی درخواست کے ساتھ لگا دیے۔

۱۹۴۷ء کے ذکر سے یاد آیا۔ میرا لاہور کو چھوڑنے کا پروگرام بہت جلدی میں طے ہوا تھا۔ اس قدر جلد لاہور چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں تھا بلکہ ارادہ تو وہیں مستقل قیام کا تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ میں شہر کے جس علاقہ میں رہتا تھا وہ سارا ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل تھا۔ یہ

کرشن نگر سے ملحقہ رام نگر کا علاقہ تھا۔ فسادات کے دنوں میں یہ علاقہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ ہم چند لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کچھ بھی ہو جائے ہم اپنا گھر بار اور اپنا وطن چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ لیکن ہر نئی صبح اس آبادی کی ایک خاصی تعداد کے ارادے کے متزلزل ہونے کی خبر لاتی تھی۔ اپنے اپنے گھروں میں جمے رہنے کا مستقل ارادہ کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز کمی ہوتی گئی اور ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ اس ساٹھ ہزار کی آبادی میں میرے سوا کوئی ہندو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سب جا چکے ہیں۔ اسی عالم میں چودہ اگست کی رات کو میں نے لاہور ریڈیو سے اپنا ترانہ پاکستان سنا:

اے سرزمینِ پاک

ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تری خاک
تندیٔ حاسداں پہ ہے غالب ترا سواک
دامن وہ سل گیا ہے جو تھا مدتوں سے چاک

اے سرزمینِ پاک

اب اپنے عزم کو ہے نیا راستہ پسند
اپنا وطن ہے آج زمانے میں سربلند
پہنچا سکے گا اس کو نہ کوئی بھی اب گزند
اپنا علم ہے چاند ستاروں سے بھی بلند
اب ہم کو دیکھتے ہیں عطارد ہو یا سماک

اے سرزمینِ پاک

اترا ہے امتحاں میں وطن آج کامیاب
اب حریت کی زلف نہیں محوِ پیچ و تاب
دولت ہے اپنے ملک کی بے حد و بے حساب
ہوں گے ہم اب ملک کی دولت سے فیضیاب
مغرب سے ہم کو خوف نہ مشرق سے ہم کو باک

اے سرزمینِ پاک

اپنے وطن کا آج بدلنے لگا نظام
اپنے وطن میں آج نہیں ہے کوئی غلام
اپنا وطن ہے راہِ ترقی پہ تیز گام
آزاد، بامراد، جواں بخت، شاد کام
اب عطر بیز ہیں، جو ہوائیں تھیں زہرناک
اے سرزمینِ پاک!
ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
اے سرزمینِ پاک

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً یہ پہلا ترانۂ پاکستان تھا جو پاکستان کے نقشۂ عالم پر نمودار ہونے کے ساتھ ہی یعنی ۱۴/ اگست کو رات کے بارہ بجے سننے والوں تک پہنچا۔

اس کے بعد بھی بہت دن میں اپنے مکان میں تنہا رہا۔ بیوی کا دسمبر ۱۹۴۶ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بچیاں راولپنڈی میں والدین کے پاس تھیں۔ میرے حصے میں تنہائی ہی تنہائی تھی۔ ساٹھ ہزار کی آبادی کے چلے جانے کے بعد بھی تنہا رہنا اس لیے مشکل نہیں تھا کہ رفیوجی کیمپ چند قدم پر تھا۔ اس کے باہر اشیائے خورد و نوش کی چھوٹی موٹی دکانیں موجود تھیں اور رفیوجی کیمپ کی وجہ سے اِدھر اُدھر پولیس اور فوج کے سپاہی بھی گشت کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ صورت حال کہاں تک رہتی۔ کسی دوست سے ملنے کی صورت نہیں تھی۔ ٹیلی فون میرے پاس نہیں تھا۔ ریڈیو کہاں تک سنتا چنانچہ ایک دن میں نے بھی اپنے مکان میں قفل ڈالا اور مہاجرین کے کیمپ میں پہنچ گیا، جو چار قدم پر تھا۔ اسی وقت مہاجرین سے بھری ہوئی ایک بس امرت سر جا رہی تھی میں اس میں بیٹھ گیا۔ بس چل پڑی۔ یہ بس میونسپل کارپوریشن کے قریب جا کے تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ میں نے باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنے ایک دوست کے ہمراہ سڑک کے کنارے نقش بہ دیوار بنے ہوئے کھڑے ہیں اور لاہور سے جانے والے مہاجرین سے بھرے ہوئے ٹرکوں اور بسوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اچانک ان کی نظر مجھ پہ پڑی۔ لپک کر بس کے نزدیک آگئے۔ مجھ سے انھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ ان کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں

میں نمی تیرنے لگی۔ میں نے بھی منہ سے کچھ نہ کہا۔ شاید کوئی بات چیت آپس میں ہوتی، لیکن بس
چل پڑی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

لاہور سے میں امرت سر پہنچا اور امرت سر سے دہلی آیا۔ دس بارہ روز یہاں رہا۔ لاہور
کی یاد دل میں ایک کھٹک بلکہ غمِ منزل بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے پھر واپسی کی ٹھانی اور
ایک روز اپنے مہربان عرش ملسیانی کو بتائے بغیر لاہور کو روانہ ہوگیا اور ایک بار پھر
مہاجرین کے اسی کیمپ میں پہنچ گیا۔ جہاں سے میں امرت سر روانہ ہوا تھا۔

کیمپ کی زندگی کی داستان ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں آکر میں نے اپنے دوستوں
کو جن کے ٹیلی فون نمبر میرے پاس درج تھے، اپنی واپسی کی اطلاع دی۔ چنانچہ نازش رضوی
آئے اور مجھے کیمپ سے اٹھا کے اپنے گھر لے گئے۔ رات کو کھانے پر شیخ عبدالشکور بھی تشریف
لائے اور اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا کہ میں لاہور میں رہوں یا یہاں سے چلا
جاؤں لیکن ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس دوران میں چند روز میں شیخ عبدالشکور کے گھر پر
بھی رہا لیکن ان کا گھر چونکہ شاہ عالمی دروازے کے اندر تھا، رنگ محل میں۔ اس لیے
ان کے نزدیک یہ علاقہ میرے لیے غیر محفوظ تھا۔

ایک دن نازش صاحب کے مکان پر ہم تینوں میں اس موضوع پر بات ہو رہی تھی
شیخ عبدالشکور نے کہا کہ آزاد! تم یہیں رہو۔ کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہم اپنی
جان تم پر نثار کر دیں گے۔ نازش بولے جی ہاں گویا یہ چوبیس گھنٹے آپ ہی کی معیت میں
رہیں گے۔ لاہور تو نہ ہوا ان کے لیے جیل خانہ ہوگیا۔

دو چار روز میں اور نازش صورت حال کا جائزہ لینے کے خیال سے لاہور کی
سڑکوں پر پھرتے رہے۔ شہر کی حالت خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔ ہندوستان سے
مسلمان مہاجرین کے اور پاکستان سے ہندو مہاجرین کے قافلوں کا تانتا بندھا ہوا
تھا۔ آخر نازش صاحب کے مشورے سے یہی طے ہوا کہ یہاں سے چلا ہی جانا چاہیے۔

واپسی میں مشکل اخراجاتِ سفر کی فراہمی کی تھی۔ میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھا
نازش بھی اس حالت میں نہ تھے کہ روپے پیسے سے میری کچھ مدد کر سکتے۔ شیخ عبدالشکور
سے ایک رات قبل ملاقات ہوتی تھی لیکن ان سے روپے کی بات کرنا میں بھول گیا تھا۔
لاہور میں ایسے بیسیوں ٹھکانے تھے جہاں پہنچ کر میں اپنی اس عارضی مشکل کو حل

کرسکتا تھا لیکن ایک تو رستے کے خطروں کی بنا پر ہر جگہ تک پہنچ پانا آسان نہ تھا۔ دوسرا یہ علوم نہیں تھا کہ کون کس عالم میں ہے۔ اچانک مجھے مولانا کا خیال آیا۔ اور میں نازش صاحب کو ساتھ لے کر ان کے مکان کی طرف چل پڑا۔ مولانا اس وقت انار کلی کے پیچھے کی طرف والے مکان میں رہتے تھے مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ بیگم صلاح الدین احمد کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ کہنے لگیں میری بیٹی داماد (اور شاید انھوں نے وجیہ کا نام بھی لیا تھا) اس وقت دہلی کے کسی رفیوجی کیمپ میں ہیں۔ تمھیں دیکھ کے میں ان کا غم بھول گئی ہوں۔ مولانا نے ان سے کہا کہ یہ سجدۂ شکرانہ کا وقت ہے۔ تمھاری مشکل اللہ نے حل کر دی ہے۔ اب بچوں کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے آزاد سے کہہ دو۔ ان سے بہتر ذریعہ نہ مل سکے گا۔

بیگم صاحبہ دراصل بہت پریشان تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دور افتادہ بچوں میں ان کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ بولیں میری تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔

اتنے میں مولانا جیسے خواب سے چونک اٹھے ہوں، مجھ سے مخاطب ہو کے کہنے لگے۔ بھئی معاف کرنا یہ تو ہم نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کب آئے، کس طرح آئے۔ محروم صاحب کہاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ساری داستان انھیں تفصیل سے کہہ سنائی کہ والدین اور بچے ابھی راولپنڈی ہی میں ہیں۔ میں دہلی کا چکر لگا کر واپس آگیا ہوں۔ خیال یہی تھا کہ لاہور ہی میں رہوں گا۔ لیکن اب فیصلہ یہی ہے کہ پھر دہلی چلا جاؤں۔ اب اس وقت اخراجاتِ سفر کا معاملہ پریشان کر رہا ہے۔

مولانا بولے کہ اگر یہ بات ہے تو تکلف کیسا۔ اس وقت گھر میں پانچ سو پینتیس روپیہ موجود ہے۔ پانچ سو تم لے لو، پینتیس ہم رکھ لیتے ہیں۔ تم اس روپے سے اپنا کام چلاؤ اور اگر ممکن ہو سکے تو دہلی پہنچ کے ہمارے بچوں کو یہ روپیہ دے دینا۔ وہ اس وقت ہمایوں کے مقبرے والے رفیوجی کیمپ میں ہیں۔

پانچ سو روپیہ میرے لیے اس نازک وقت میں قارون کے خزانے سے کم نہ تھا۔ ہم دونوں کافی دیر بیٹھے اور پھر مولانا اور بیگم صاحبہ سے یہ کہہ کے رخصت ہوئے کہ دیکھیں اب کب ملاقات ہوتی ہے۔

روانگی سے پہلے شیخ عبدالشکور صاحب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ ہم ان کے دفتر میں پہنچے۔ مولانا سے ملاقات کا ذکر اُن سے کیا۔ روپے کی بات بتائی تو وہ کچھ خفا سے ہوئے کہ جب میں موجود ہوں تو مولانا کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ یہ روپیہ مولانا کو واپس دے دیا جائے اور میری ضروریات شیخ صاحب ہی پوری کریں۔ مجھے یہ بات نامناسب معلوم ہوتی، لیکن شیخ صاحب نے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ کھول کے میرے سامنے رکھ دیا کہ اس میں سے تمھیں ضرور لینا ہوگا۔ انکار کرنے پر میں نے دیکھا کہ شیخ صاحب برا مان رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے بلاضرورت اس میں سے دس دس روپے کے تین چار نوٹ لے لیے۔

اب لاہور سے روانہ ہوتے وقت میں نے مولانا کے پانچ سو روپے اندر کی جیب میں رکھ لیے اور شیخ صاحب کے تیس چالیس روپے باہر کی جیب میں کہ مولانا کا روپیہ ایک طرح سے امانت تھا جو اُن کے بچوں تک پہنچانا تھا، اور شیخ صاحب کے روپے سے مجھے سفر کی منزلیں طے کرنا تھیں۔ جالندھر پہنچا تو باہر کی جیب کٹ گئی اور شیخ صاحب کا روپیہ جیب تراش لے گیا۔ مسافری میں آٹا گیلا۔ اب مولانا کے روپے میں سے میں نے تیس تیس روپے نکالے اور باقی سفر طے کیا۔

دہلی واپس آکر میں نے عرش صاحب اور پنڈت ہری چند اختر مرحوم کو سارا واقعہ کہہ سنایا اور ان سے کہا کہ یہ روپیہ مولانا کے بچوں کو ہمایوں کے مقبرے والے رفیوجی کیمپ میں پہنچانا ہے۔ عرش صاحب نے بتایا کہ کیمپ کے باہر فوج کا پہرہ ہے اور ہندوؤں کا وہاں جانا ممنوع ہے۔ ہم کوشش کریں گے لیکن امید نہیں کہ کامیابی ہو سکے۔

میں اس وقت روزانہ "ملاپ" سے وابستہ ہو چکا تھا اور ملاپ کا دفتر ہی میرا دفتر بھی تھا۔ اور گھر بھی۔ رات کو کام ختم کر کے میں وہیں زمین پر یا میز پر سو جایا کرتا تھا — گویا ایک طرح سے خانہ بدوشی کی زندگی تھی۔ اس حالت میں یہ روپیہ میں نے اپنے پاس رکھنا مناسب نہ سمجھا اور عرش صاحب کے حوالے کر دیا۔ مولانا کو میں نے خط لکھ دیا کہ روپیہ بچوں تک پہنچانا تو ناممکن نظر آرہا ہے۔ اب بتائیے۔ کیا کیا جائے۔ اس خط کے جواب میں مولانا خود دہلی آئے۔ گویا انتہائی مخدوش حالات میں اور جب ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا ان سے پھر ایک ملاقات ہوئی۔ وہ روپیہ مولانا نے عرش سے لے کر خود بچوں کے حوالے کیا اور انھیں کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ خدا جانے کن مشکلوں سے انھوں نے یہ سفر طے کیا ہوگا۔ اس وقت

کے سفر کا خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

عرش سے مولانا صلاح الدین کی یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ ابھی اگلے دن جب مولانا کے انتقال کی خبر آئی تو عرش بڑی دیر تک ٹیلی فون پر مولانا کا ذکر کرتے رہے۔ اس بات چیت میں انھوں نے پانچ سو روپے والا واقعہ یاد دلایا اور کہا کہ یہ میری مولانا سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

میں جذبات کی رو میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ۱۹۳۷ء کا ذکر کرتے کرتے میں نے ایک لمبی جست لگائی اور ۱۹۴۷ء کا ذکر لے بیٹھا۔

کہہ تو میں یہ رہا تھا کہ کس طرح مولانا شعر و ادب کے معاملے میں قدم قدم پر میری راہنمائی کرتے تھے۔ ایک بار میں ایک بہت ہی پرانی کتاب "رامائن" مصنفہ شنکر دیال فرحت لے کر ان کے پاس پہنچا۔ آٹھ ہزار شعر کی یہ مثنوی اِدھر اُدھر سے دیکھ کر مجھ سے انھوں نے کہا کہ یہ ایک گمنام کتاب ہے لیکن بہت عمدہ اور بہت معیاری معلوم ہوتی ہے۔ تم اس پر ایک مقالہ لکھو۔ میرا یہ مقالہ "اردو کی ایک گمنام مثنوی" کے عنوان سے چند ماہ بعد "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ مولانا نے اپنے اداریے میں اس پر قریباً ایک صفحے کا تعریفی نوٹ لکھا۔ مثنوی تو خیر تھی ہی تعریف کے قابل لیکن انھوں نے میرا دل بڑھانے میں بھی کوئی کمی نہ چھوڑی۔

اتفاق کی بات کہ حرماں خیرآبادی کو یہ مثنوی پسند نہ آئی۔ وہ ایک دن "ادبی دنیا" کے دفتر میں میرے ساتھ یہ بحث لے بیٹھے کہ یہ مثنوی تو کوئی معیاری کلام نہیں۔ تم نے کیا اتنا لمبا چوڑا مقالہ اس پر لکھ ڈالا۔ جہاں تک بحث مباحثے کا تعلق ہے۔ میں خاصا پھسڈی واقع ہوا ہوں۔ ان کے ایک آدھ اعتراض کا جواب دے کے میں تو خاموش ہو گیا لیکن مولانا نے بحث شروع کر دی اور میرے مقالے ہی میں سے مثنوی کے اقتباسات سنا سنا کر حرماں صاحب کو قائل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے کہ یہ مثنوی اردو شاعری میں ایک اونچے مقام کی حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گوشۂ گمنامی میں پڑی ہے۔

اس مقالے کی اشاعت کے بعد میرے محترم شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے مجھے بتایا کہ اکثر لوگوں نے اس کتاب کے بارے میں پوچھا ہے اور اس کی فرمائش کی ہے لیکن افسوس کہ یہ کتاب اس وقت نایاب تھی، غالباً اب بھی نایاب ہے۔ یہ کتاب منشی نول کشور نے چھاپی تھی۔ لیکن شیشہ و جام و مینا کی رونق تو ساقی ہی کے دم تک رہتی ہے۔

شام کو اکثر مولانا، عاشق حسین بٹالوی اور راقم التحریر "ادبی دنیا" کے دفتر سے

اکٹھے اٹھتے تھے اور نیلا گنبد چوک میں واقع (نئی انارکلی اور پرانی انارکلی کے چوراہے پر) نگینہ بیکری میں آکر جم جایا کرتے تھے۔ وہاں باری علیگ اکثر مولانا کے منتظر ہوتے تھے۔ عاشق حسین بٹالوی اور باری گفتگو برائے گفتگو کے فن میں ماہر تھے۔ عاشق صاحب آج کل لندن میں مقیم ہیں اور اپنی گل افشانیِ گفتار سے انگلستان کے ہندوستانی اور پاکستانی ملقوں کو نہکا رہے ہیں۔ باری علیگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اپنی اس رواروی کی بات چیت میں یہ بات تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہندو بلوائیوں نے دوبار مولانا کا مکان لوٹا، لیکن مولانا کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ شہر والے مکان میں لُٹ جانے کے بعد مولانا چوبرجی کے علاقے میں اٹھ آئے لیکن وہاں بھی بلوائیوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہ سکے چنانچہ یہ مکان بھی انھیں چھوڑنا پڑا اور وہ انارکلی کے پیچھے ایک مکان میں آکر اقامت گزیں ہوئے۔ غالباً یہ مکان انھیں میسرز نارائن داس بھگوان داس کے پروپرائٹر لالہ دوارکا داس شعلہ نے لے کر دیا تھا۔ یہ مکان چونکہ شعلہ صاحب کے مکان سے قریب تھا۔ اس لیے وہ اس طرح سے بخوبی مولانا کی حفاظت کر سکتے تھے۔

چوبرجی والے مکان میں قیام کے دوران میں مولانا مجھ سے قریباً ہر روز ایک واقع کا ذکر کرتے تھے اور پھر اس پر خوب قہقہے لگاتے تھے۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ مولانا ہر صبح ایک گوالے کے ہاں دودھ لانے جایا کرتے تھے۔ دودھ کے گاہکوں میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی لیکن چونکہ اس محلے کا نام رام نگر تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم تھی۔ گوالے کے ہاں صبح کو زیادہ تر ہندو ہی جایا کرتے تھے مسلمان کوئی اکا دکا ہی پہنچتا تھا۔ مولانا کہتے تھے کہ ہر صبح جب میں گوالے کے ہاں پہنچتا ہوں تو میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر ہندو سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں "ایم" "ایم" یہ لفظ "مسلمان" کی تخفیف تھی۔ میں کہتا تھا مولانا یہ آپ کو کس نے مشورہ دیا ہے کہ آپ آج کل جب کہ فرقہ وارانہ منافرت زوروں پر ہے ہندوؤں کے محلے میں جا کر اقامت گزیں ہوں۔ بالخصوص جب کہ ایک بار آپ کا مکان لُٹ چکا ہے۔ مولانا اس پر قہقہہ لگاتے اور کہتے آخر کہاں جاؤں کہیں تو رہنا ہی ہے مولانا دراصل زندگی کی ساری تلخیوں کو قہقہوں ہی میں اڑانے کے عادی تھے۔

میں نے ایک دن حوصلہ کر کے کہا کہ مولانا آپ میرے یہاں آجائیے۔ اتنا بڑا مکان ہے۔ میں اس میں اکیلا ہوں۔ میرے لیے ایک ہی کمرہ کافی ہے۔ باقی مکان آپ استعمال کیجئے۔ بولے اب وہ تمھاری منطق کہاں گئی۔ وہ مکان بھی تو ہندو محلے میں ہے۔ میں نے فوراً کہا کہ وہاں ہندوؤں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے نہیں ہیں اس لیے کہ چار قدم پر دریا کے کنارے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی آبادی ہے۔

ایک دن مولانا کے ساتھ ایسی ہی "فلسفیانہ" گفتگو کر کے جب میں رات کو واپس آیا تو دروازے پر پہنچتے ہی مٹی کے تیل کی بو نے میرا استقبال کیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ جب غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ سارا دروازہ مٹی کے تیل میں شرابور ہے۔ خدا جانے کسی "مسلمان" نے اس مکان کو آگ لگانے کا ارادہ کیا اور پھر اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر چلا گیا۔ یا کسی "ہندو" نے اسے مسلمان کا مکان سمجھ کر نذرِ آتش کرنا چاہا۔ معلوم نہیں اصلیت کیا تھی۔ لیکن اس اصلیت کو جاننے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا۔

اُدھر مولانا کے محلے میں آخر "ایم۔ ایم" کا جذبہ رنگ لایا اور ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ رات کو مولانا کے مکان پر حملہ ہوا اور وہ بہ مشکل اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔

اس کے باوجود مولانا کی زبان پر کبھی ہندوؤں کا گلہ شکوہ نہ آیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ فعل چند غنڈوں کا ہے۔ قوم کی قوم ایسی نہیں۔ شرفا تو خود اپنی جان بچانے کی فکر میں ہیں۔ ایسے عالم میں بھی جب ہم مال روڈ سے گزرتے تھے تو مولانا سر گنگا رام کے بُت کو دیکھ کر اکثر کہتے تھے، کہ انسان ہو تو ایسا۔ سارے پنجاب نے ایسا سخی، باحوصلہ اور فراخ دل انسان پیدا نہیں کیا۔ یہ اپنے وقت کا حاتم تھا حاتم۔

ایک بار "ادبی دنیا" کے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مشرقی پنجاب میں "ادبی دنیا" کے کئی ہزار خریدار ہیں۔ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو اردو کے ان عاشقوں تک "ادبی دنیا" کیسے پہنچ سکے گا۔

تقسیم ملک کی بات برسبیلِ تذکرہ ہی ان کی زبان پر آگئی۔ اصل میں سیاست اُن کا موضوعِ گفتگو یا موضوعِ تحریر کبھی نہیں رہا۔ ان کا موضوع تو صرف ایک تھا اور وہ تھا:

"اردو" اردو مولانا کا اوڑھنا بچھونا نہیں تھی بلکہ ان کی روحِ رواں تھی۔ قیام پاکستان کے لیے انھوں نے کبھی کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یا ممکن ہے میرے ساتھ بات چیت کے دوران میں وہ یہ موضوع نہ چھیڑنا چاہتے ہوں۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق کے دوران میں سیاسی موضوعات چھیڑ دیا کرتے تھے۔ جب ملک تقسیم ہونے لگا اور اس قسم کی خبریں آنا شروع ہوئیں کہ کانگریس والے ہندوستانیوں کا پہلا گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بنائیں گے اور پاکستان کا گورنر جنرل کوئی پاکستانی ہوگا۔ غالباً قائدِ اعظم محمد علی جناح تو مولانا نے ایک دن دورانِ گفتگو میں کہا آزاد! اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کانگریس مسلم لیگ اور مسلم لیگ کانگریس بن گئی ہے۔

تقسیم ہند سے ذرا قبل سیاست نے ایک عجیب و غریب پلٹا کھایا تھا۔ مسلم لیگ نے سارے پنجاب اور سارے بنگال کا مطالبہ کیا تھا۔ اس الجھن کا واحد حل یہی نظر آنے لگا تھا کہ اب تقسیم کے سوال کو مان کر اس جھگڑے کو ختم کیا جائے۔ مولانا نے اس زمانے میں مجھ سے کہا تھا کہ اب تم لوگ مشکل میں پھنس گئے ہو۔ اب صورت حال صرف یہی رہ گئی ہے کہ مسلم لیگ کے جواب میں تم ایک نیا نعرہ شروع کرو اور وہ نعرہ یہ ہو " دے کے رہیں گے پاکستان "۔

۱۹۴۶ء میں جب میری رفیقۂ حیات مرض الموت میں مبتلا ہوئی تو میرا "ادبی دنیا" کے دفتر میں جانا مقابلتہً کم ہوگیا۔ اس دوران میں مولانا میرے یہاں آنے لگے۔ مریضہ کی حالت تفصیل سے پوچھتے تھے اور میری دل جوئی میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھتے تھے۔

مولانا میرے لیے اپنی اس قدر فراواں محبت کے باوجود میری ایک بات سخت ناپسند کرتے تھے اور وہ تھی میری مشاعروں میں شرکت۔ مشاعروں کو انھوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اس وقت تو مولانا کی اصابتِ رائے پر میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب جب مشاعروں پر نظر کرتا ہوں تو ان کی رائے پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کے بعد جب میں ہندوستان آگیا تو بھی مولانا کے ساتھ میری ملاقاتوں میں کوئی کمی نہ آئی اور اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان کے مشاعروں میں شرکت کے لیے میں سال میں ایک دو بار پاکستان پہنچ جایا کرتا تھا اور لاہور سفر پاکستان کی پہلی منزل تو تھی ہی۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں دہلی سے براہِ راست کراچی پہنچ جایا کرتا تھا۔

لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا تھا۔ اس صورت میں اکثر واپسی کا سفر میں لاہور ہی کے رستے سے کیا کرتا تھا۔ لاہور سے میں گزروں اور مولانا سے ملاقات نہ ہو' اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا

پاکستان بننے کے بعد میں نے ان سے ایک ایسی ہی ملاقات کے دوران میں پوچھا مولانا مشاعروں کے بارے میں آپ کی آج بھی وہی رائے ہے اور کیا آپ مشاعروں میں میری شرکت اب بھی پسند نہیں کرتے، کہنے لگے بالکل ناپسند کرتا ہوں، میری رائے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا حضور اگر مشاعروں سے میں تائب ہو جاؤں تو یہ سال میں دو چار ملاقات جو آپ سے ہو جاتی ہے اور وہ بھی لاہور میں وہ کیسے ہو۔ گویا کسی خواب سے چونک اٹھے ہوں۔ کہنے لگے نہیں، بھئی یہاں تو ضرور آیا کرو اور مولانا کو میری آمد سے واقعی خوشی ہوتی تھی۔ اگر کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں نے لاہور پہنچ کر ان سے ملنے میں دیر کر دی تو وہ خود آ کر مجھے ڈھونڈ نکالتے تھے۔ میرے دوست ثناء اللہ خاں کے مکان پر تو ایسا کئی بار ہوا کہ میں ابھی مولانا سے ملنے کا پروگرام بنا رہا ہوں کہ مولانا پیچ در پیچ زینے کا مرحلہ طے کرنے کے بعد میرے سامنے موجود ہیں۔

یہ تو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اردو سے مولانا کا عشق کس قدر والہانہ صورت اختیار کر چکا تھا۔ "ادبی دنیا" کو انھوں نے جس طرح مختلف ادوار میں زندہ و سلامت رکھا یہ انہی کی ہمت تھی۔ بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد وہ کسی حد تک دل گرفتہ رہنے لگے تھے اور اس دل گرفتگی کا اظہار ان کے بعض خطوں سے ہوتا ہے، جو انھوں نے مجھے لکھے۔ زندگی کے اس خلا کو انھوں نے بڑی حد تک عشقِ اردو کی بدولت پر کر لیا تھا۔ اور ایک دن جب میں نے لاہور کے کسی اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ مولانا نے اپنی ساری جائداد فروخت کر کے اردو فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی ہے، تو غائبانہ طور پر فرطِ عقیدت سے میرا سر اردو کے اس عاشق کے سامنے جھک گیا۔ اردو کی ساری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اتنا بڑا ایثار اس زبان کے لیے کتنی ہستیوں نے کیا ہوگا۔ اور حیرت ہے کہ اس ایثار کا ذکر مولانا نے مجھ سے اپنے کسی خط میں نہیں کیا ـــــ میں اس درویش کے مزاج سے واقف ہوں۔

میں مولانا سے ان کے ۱۲؍ مارچ والے خط کے جواب میں اُن سے یہ شکایت بھی کرنا چاہتا تھا کہ انھوں نے جائداد فروخت کر کے اردو فاؤنڈیشن کے قیام کی خبر سے مجھے محروم رکھا ہے لیکن میں ابھی خط کا جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ لاہور سے مولانا کے

انتقال کی اطلاع ملی۔ لکھنے لکھانے کی تمام باتیں دل ہی میں رہ گئیں۔ اب شکوہ شکایت کروں بھی تو کس سے۔ اب تو صرف خوب صورت یادوں کا ایک تصور ہی باقی رہ گیا ہے۔ مولانا چلے گئے اور نہ جانے والی یادوں کی ایک کائنات دے گئے اور آج یادوں کے ساتھ بار بار یہ مصرع ذہن میں اُبھر رہا ہے۔ ؏

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

نئی دہلی

۱۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء

ابوالکلام آزاد

از شمارِ دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

دسمبر ۱۹۵۳ء کی آخری تاریخوں کا ذکر ہے۔ قبلہ جوشؔ ملیح آبادی نے مجھے ایک پرچہ لکھ کر بھیجا۔

یکم جنوری — ساڑھے آٹھ بجے صبح — ملاقات — مولانا آزاد

شام کو میں جب کسی کام کے سلسلے میں جوشؔ صاحب کے کمرے میں گیا تو ان سے کہا کہ وہ پرچہ مجھے مل گیا ہے۔ میں کل صبح آٹھ بجے آپ کے یہاں پہنچ جاؤں گا اور اکٹھے مولانا صاحب سے ملنے چلیں گے۔

"مجھے تو ان سے ملنے نہیں جانا ہے۔ انھوں نے آپ کو وقت دیا ہے،" جوشؔ صاحب نے جواب میں کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ملاقات کا وقت لیا ہو۔ جب میں نے جوشؔ صاحب سے کہا کہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مولانا نے کیوں ملاقات کے لیے وقت دیا ہے تو انھوں نے بتایا کہ اجمل صاحب نے فون پر بتایا ہے۔ آپ نے وقت مانگا ہوگا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ کئی ماہ قبل اجمل صاحب سے میں نے کہا تھا کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کی آرزو ہے۔ ممکن ہو تو کبھی ملاقات کرا دیجیے گا۔ اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے

تھے۔ میں بھول چکا تھا لیکن اجمل صاحب کو یاد تھا۔ انھوں نے ملاقات کے لیے وقت دلوا دیا تھا۔[1]

کل مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ اس تصور سے مجھے مسرت بھی ہو رہی تھی اور ایک ہلکی سی گھبراہٹ بھی تھی کہ مشرق کے اتنے بڑے عالم سے ملاقات ہوگی تو مجھ ایسا بے علم کس موضوع پر گفتگو کرے گا۔ مولانا مشرقی علوم کے ایک بحرِ ذخار ہیں اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ حذف چینوں میں اپنا شمار نہیں۔ خیر یہ تو دور کی بات ہے۔ مولانا نے آنے کا مقصد پوچھ لیا تو کیا کہوں گا۔ صرف شوقِ دیدار یا اظہار نیاز ـــــ ایسی مصروف

---

[1] جوش صاحب ماہنامہ "آج کل" کے مدیر تھے اور میں نائب مدیر۔ جوش صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ اگر موڈ ہو تو جب کسی سے ملاقات کے لیے جاتے تھے تو مجھ سے کہتے تھے چلو تمھیں بھی ملا لائیں۔ سب سے پہلے جوش صاحب ہی کی رفاقت میں مجھے جواہر لال نہرو کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

ایک واقعہ کا ذکر ہے:

محترمہ سروجنی نائیڈو راشٹرپتی بھون میں مقیم تھیں۔ جوش صاحب ان سے ملنے گئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں اس عظیم المرتبت خاتون کی زندگی کی ایک تابناک جھلک دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ دورانِ گفتگو میں سروجنی نائیڈو نے از خود ساغر نظامی کا ذکر کیا اور جوش صاحب سے ان کی مالی حالت کے بارے میں پوچھا۔ جوش صاحب کے اس جواب پر کہ ساغر ان دنوں کچھ پریشان ہیں انھوں نے اپنے سکریٹری کو نوٹ کرادیا کہ لکھنؤ پہنچ کر مجھے یاد دلانا میں ساغر کے متعلق ضرور کچھ کروں گی۔ میں نے یہ واقعہ تفصیل سے اپنی کتاب "نشانِ منزل" میں بیان کیا ہے۔

اپنے رفیقوں کو ان شخصیتوں سے ملانا جو کسی نہ کسی طرح سے فن و ہنر کی قدر دانی کی اہل ہوں، جوش صاحب کے کردار کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھا تھا کہ شاید جوش صاحب مولانا سے ملاقات کرانے کے لیے مجھے لے جا رہے ہیں۔

شخصیت کا وقت محض اس لیے جا کر ضائع کرنا کہ انھیں دیکھنے کی آرزو ہے۔ یہ بھی کوئی مستحسن بات نہیں۔ لیکن ملاقات کا موقع مل رہا تھا اسے میں ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا یہی فیصلہ کیا کہ "بے کراں[1]" کے نئے ایڈیشن کی ایک جلد لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ کہوں گا کہ یہ پیش کرنے کے لیے آیا ہوں۔

یہی ملے جلے جذبات دل میں لیے اگلی صبح ۴ - کنگ ایڈورڈ روڈ پر جا پہنچا۔ اجمل صاحب نے اطلاع کرائی اور مولانا نے اندر کمرے میں بلا لیا۔

ایک سادہ سے کمرے میں جس کا ایک دروازہ پائیں باغ میں کھلتا تھا۔ مولانا ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مولانا کی پر وقار شخصیت سارے ماحول پر اثر انداز تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہوا۔ میری کیفیت اس وقت وہی تھی جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کی ہے ؎

من حضورِ آں شہ والا گہر
بے ہنر مردے بہ دربارِ عمرؓ

میرے آداب عرض کے جواب میں مولانا نے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی اس خواہش کو دل میں دبائے کہ مولانا کے حضور مجھے ان کے قدموں میں فرش پر بیٹھنا چاہیے۔ کرسی پر بیٹھ گیا۔

ان کے بائیں طرف ایک دوسرے کے اوپر سگار کے متعدد ڈبے رکھے تھے۔ اس وقت بھی وہ سگار پی رہے تھے۔ میں نے یہ کہہ کر کہ یہ میرا مجموعۂ کلام ہے "بیکراں" ان کی نذر کی۔ آپ نے کتاب لے کر ایک سرسری سی ورق گردانی کی اور تھوڑی دیر کے بعد بولے۔ مجھے یاد ہے آپ نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مجھے ڈاک سے بھیجا تھا۔ میں ان کی قوت حافظہ دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ انھوں نے جس بات کا ذکر کیا تھا اسے چار برس ہو چکے تھے اور پھر میرے مجموعۂ کلام کا مولانا کے پاس پہنچنا کون سی ایسی بڑی بات تھی ؎

نایاب نہیں متاعِ گفتار
صد انوری و ہزار جامی

اور مولانا کا یہ یاد رکھنا کہ میں نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن انھیں ڈاک سے بھیجا تھا۔ ایسی بات

---

[1] مصنف کا پہلا مجموعۂ کلام

کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے عرض کیا یہ دوسرا ایڈیشن پہلے سے بہت مختلف ہے۔ اس میں متعدد غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جو پہلے ایڈیشن میں نہیں تھیں۔ اس لیے یہ کتاب دوبارہ پیش کر رہا ہوں۔

یہ ایک مختصر ملاقات تھی۔ میں نے گزارش کی کہ ہم نئے لکھنے والوں کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ اگر آپ سیاسی مصروفیات سے کچھ وقت ہمارے لیے نکال سکیں تو ہم دو یا تین ماہ میں ایک بار پندرہ بیس یا پچیس کی تعداد میں آپ کے یہاں حاضر ہوں اور آپ کی ذات سے فیض حاصل کریں۔

کہنے لگے ہاں! فیضی صاحب نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی۔ ذرا فرصت ملے تو میں اس طرف توجہ کروں گا ـــ اور یہ فرصت مولانا کو زندگی بھر نہ مل سکی۔

دورانِ گفتگو میں اردو کے سلسلے میں تحقیقی کام کا ذکر آیا تو آپ نے خاص طور سے مولانا غلام رسول مہر کا نام لیا اور کہا اس سلسلے میں آج کل مہر صاحب بڑا کام کر رہے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ کس فقرے پر ایسا ہوا لیکن جلد ہی ان کا طرزِ تخاطب "آپ" کے عوض "تم" میں تبدیل ہو گیا۔ میں چلنے لگا تو آپ نے فرمایا "کیا تنخواہ پاتے ہو؟" میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ کی عنایت سے میں پبلی کیشنز ڈویژن میں ملازم ہوں اور اپنی تنخواہ بتائی۔ انھوں نے اظہارِ اطمینان کیا۔ میں آداب بجا لایا اور اجازت طلب ہوا۔

یہ مولانا کی خدمت میں پہلی حاضری تھی۔ دوسری بار کوئی چھ ماہ بعد یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اب کے والد محترم کی کتاب "رباعیاتِ محروم" کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ والد اور میں دونوں مولانا کے دولت خانہ پر پہنچے۔ اس ملاقات میں مولانا کی باتیں والد سے ہوتی رہیں۔

والد پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں پروفیسر ہیں جس میں ہزاروں طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ یہ کالج روزِ اول سے ہی کشمکشِ موت و حیات میں مبتلا ہے۔ اگر ابھی تک یہ کالج چل رہا ہے تو یہ مولانا کی خاص عنایت کا نتیجہ ہے ورنہ حالات اس ادارے کے

کبھی سازگار نہیں رہے۔ والد سے اسٹاف کے اراکین نے کہا تھا کہ مولانا سے آپ کالج کا ذکر ضرور کیجیے گا۔ والد نے موقع پاکر یہ ذکر چھیڑا۔ مولانا بڑی توجہ سے سنتے رہے اور بعد میں بولے کہ یہ تو فیصلہ ہے کہ یہ کالج بند نہیں ہوگا۔ اس سے ہزاروں مہاجر طلبہ اور سیکڑوں اساتذہ وابستہ ہیں۔ اسے ہم بند نہیں ہونے دیں گے۔ آنند[1] کمار صاحب اس کالج کی اہمیت تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ پھر کہنے لگے یہ کالج اہلِ پنجاب کی ہمت کا نمونہ ہے۔ مہاجرین کو اسی طرح اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حکومت اس سلسلے میں پوری مدد دے گی۔

اس ملاقات میں دورِ مخزن کے شاعروں اور ادیبوں کا بھی ذکر چل نکلا۔ پھر میری طرف اشارہ کرکے والد صاحب سے فرمانے لگے ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ذوقِ ادب ایک ہی گھر میں دو نسلوں تک چلا ہو۔ والد نے کہا ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر انھوں نے میر انیس اور قبلہ جوش ملسیانی اور عرش ملسیانی کی مثالیں دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن کم۔ سیاست میں تو ایسی مثالیں بہت ہیں لیکن ادب میں کم۔ ہم چلنے لگے تو مولانا نے کہا کہ آپ مطمئن رہیئے کیمپ کالج بند نہیں ہوگا۔ مولانا کے ارشاد کے مطابق کالج تو بند نہ ہوا لیکن کچھ مدت بعد عمر کی بنا پر کالج سے والد کی سبکدوشی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اب کے والد پھر مولانا کے پاس پہنچے۔ مولانا نے فرمایا کہ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے عمر کی بنا پر ریٹائر ہونے کا کیا سوال۔ آپ کی موجودگی تو کالج کے لیے باعثِ فخر ہے۔ میں اس سلسلے میں چانسلر کو چٹھی لکھوں گا۔ چنانچہ مولانا نے چانسلر یا وائس چانسلر دیوان آنند کمار کو چٹھی لکھی۔ خدا جانے مولانا نے چٹھی میں کیا لکھا لیکن وہ دن اور آج کا دن۔ اس واقعہ کو کئی برس ہونے کو آئے ہیں، والد کی سبکدوشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

مولانا کے انتقال سے چند روز قبل والد مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اب میں تھک گیا ہوں۔ کالج میں مجھ سے کام نہیں ہوتا کسی دن مولانا سے ملنے چلیں تاکہ ان کا شکریہ ادا کریں اور ان سے اجازت لے کر میں ملازمت سے استعفےٰ پیش کردوں۔

---

[1] دیوان آنند کمار۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر۔

استعفےٰ تو والد اب بھی دے دیں گے۔ کیونکہ اس دور میں ملازمت سے مستعفی ہونا کون سی مشکل بات ہے۔ لیکن مولانا سے اجازت لینے کی آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔

مجھے تیسری بار مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع اس وقت ملا جب میں اپنا مجموعۂ کلام "ستاروں سے ذرّوں تک" کا نیا ایڈیشن انھیں پیش کرنے کے لیے گیا۔ اب کے میں جوشؔ صاحب کے ساتھ گیا تھا۔ جوشؔ صاحب کے بھائی جناب رئیس احمد خاں بھی ساتھ تھے۔ اس قافلے میں ایک صاحب اور بھی تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مولانا علیل تھے آپ بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور دفتر کی کسی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے کتاب پیش کی۔ آپ نے لے کے رکھ لی۔ شگفتہ اور پُرسکون چہرے پر اضمحلال کی کیفیت نمایاں تھی۔ جوشؔ صاحب نے مزاج پُرسی کی۔ ان سے مختصر بات ہوئی۔ اس دوران میں اجمل صاحب بھی کمرے ہی میں موجود رہے۔ میں اور رئیس احمد صاحب خاموش ہی رہے تھے پانچ سات منٹ کے بعد ہم لوگ آ گئے۔

یہ ملاقات مولانا سے ایک خاموش ملاقات تھی۔ اس عظیم شخصیت کی خاموشی ایک تقریر سے کم نہ تھی جسے اب الفاظ میں لانا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔

بیماری کا حملہ اور دفتر کے کام میں — یہ انہماک۔ چہرہ نقاہت کے باوجود یقین کی تجلی سے جگمگا رہا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہے ؎

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی

مولانا سے ملاقات کا بہانہ اُس وقت پیدا ہوتا تھا جب میری یا والد کی کوئی نئی کتاب چھپتی تھی چنانچہ اس عظیم شخصیت سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب "گنجِ معانی" کا نیا ایڈیشن چھپا۔ ملاقات کا وقت بالعموم صبح ہی کا ملتا تھا۔ اجمل صاحب نے ہمیں کہا کہ مولانا نے وقت دے تو دیا ہے، لیکن آج وہ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ میں نے کہا کہ پانچ سات منٹ میں ہم لوگ اٹھ آئیں گے۔ کتاب ہی تو پیش کرنا ہے۔ لیکن خلافِ توقع یہ ملاقات طویل ہو گئی۔ والد نے "گنجِ معانی" پیش کی مولانا یہ کتاب اس زمانے میں دیکھ چکے تھے۔ جب اس کا پہلا ایڈیشن لاہور کی مشہور فرم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز نے شائع کیا تھا۔ کہنے لگے کہ یہ کتاب ابھی چھپی نہیں تھی کہ سر عبدالقادر نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا جی ہاں قبلہ شیخ صاحب ہی نے اس کا دیباچہ لکھا تھا اور وہی دیباچہ موجودہ ایڈیشن میں بھی شامل ہے ——————

——— آپ کتاب کی ورق گردانی کرتے رہے۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولے کہ اس ضخامت کی کتاب کی قیمت سات روپے آٹھ آنے زیادہ نہیں ہے۔ میں حیران تھا کہ اس قسم کی بات مولانا نے آج سے پہلے کبھی کی نہیں۔ آج یہ کتاب کی ضخامت اور اس کی قیمت کا ذکر کیوں کر رہے ہیں۔ بولے کس نے شائع کی ہے اور خود ہی ناشر کا نام دیکھ کر کہنے لگے۔ یہ دہلی کتاب گھر کیسا ادارہ ہے۔ میں نے عرض کیا، جناب یہ ادارہ وادارہ کچھ نہیں ہے۔ یہ تو ایک فرضی نام ہے۔ کتاب میں نے خود شائع کی ہے اور اس پر دہلی کتاب گھر کا نام لکھ دیا ہے۔ جو کتاب میں خود شائع کرتا ہوں اس پر اسی ادارے کا نام لکھ دیتا ہوں۔ اکثر و بیشتر ناشر معاملے کے صاف نہیں ہیں۔ اس لیے مصنف اپنی کتابیں خود چھاپنے پر مجبور ہے حالانکہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ مولانا نے ساری بات بڑی توجہ سے سنی اور مجھ سے پوچھا اس کی فروخت کا کیا انتظام ہے۔ اب مجھے تفصیل سے بات کرنے کا حوصلہ ہوا۔ میں نے بتایا کہ ہم اپنی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ذریعے سے فروخت کرتے ہیں کیونکہ بہت نقصان اٹھانے کے بعد یہ ایک معاملے کا صاف ادارہ ہمیں ملا ہے۔ لیکن یہ ادارہ کتابیں فروخت کرنے کے لیے ہم سے چالیس فیصدی کمیشن لیتا ہے ——— اب اگر لاگت میں مصنف کی رائلٹی۔ کم ازکم پندرہ فیصدی بھی شامل کرلی جائے جس کا موجودہ صورت میں سوال پیدا نہیں ہوتا تو یہ کتاب چھاپ کر ہمیں صریحاً نقصان ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ کتابت و طباعت کا سامان روز بروز گراں ہوتا جارہا ہے۔ نیز کتاب کی خاصی تعداد بسلسلۂ تبصرہ اور تحفہ تحائف کی نذر ہو جاتی ہے۔

یہ ساری روداد سن کر فرمانے لگے۔ آپ صحیح کہتے ہیں۔ جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے۔ آپ مجھے ایک درخواست دیجیے۔ میں اس کے لیے کچھ سوچوں گا۔ چنانچہ چند روز میں اس کتاب کے بارے میں درخواست دے دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کے دو اداروں نے اس کتاب کی ایک خاصی تعداد خریدی اور کتاب چھاپنے کے بعد جو نقصان کا اندیشہ تھا مولانا کی عنایت سے مفقود ہو گیا۔

اس ملاقات میں میں نے ہند و پاکستان کے مصنفین کے ان نقصانات کا ذکر کیا۔ جو دوسرے ملک کے ناشرین کی بدولت انھیں برداشت کرنا پڑ رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ ان کی کتابیں ان کی اجازت کے بغیر پاکستان میں چھاپی جارہی ہیں۔ کہنے لگے

کاپی رائٹ ایکٹ میں ہم اب ایک ایسی ترمیم کر رہے ہیں کہ ان ملکوں کے ناشرین ایک دوسرے کے ملک کے مصنفین کی کتابیں بغیر اجازت شائع نہ کر سکیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر دونوں ملکوں میں کتابوں کی آمد و رفت پر پابندی ہٹالی جائے تو بھی اس بدعت کا بڑی حد تک تدارک ہو سکتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ ایک پیکٹ میں پچاس روپے سے زیادہ کی کتابیں (اور وہ بھی ڈاک کے ذریعے سے) ایک سے دوسرے ملک میں نہیں بھیجی جا سکتیں۔ قانون ایسا ہونا چاہیئے کہ براہ راست بڑے بڑے ریلوے پارسل اور ڈاک کے ذریعے سے وی پی کے پیکٹ بھیجے جا سکیں۔ فرمانے لگے یہ پابندی جو تم بتا رہے ہو کس نے عائد کی ہے حکومت پاکستان نے یا ہم نے؟ میں نے کہا مجھے صحیح طور پر تو معلوم نہیں لیکن غالباً یہ پابندی دونوں ملکوں کی عائد کردہ ہے۔ آپ نے بڑے اطمینان بخش لہجے میں کہا کہ میں دریافت کروں گا کہ پاکستان کے ساتھ جو کانفرنسیں ہوئی ہیں ان میں کسی وقت یہ سوال پاکستان کے ساتھ اٹھایا گیا ہے تو اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس مسئلے کا حل کرنا بہت ضروری ہے۔ موجودہ صورت میں جس کتاب کے تین ایڈیشن چھپتے ہیں اگر یہ پابندی ہٹ جائے تو اس کے کتنی اور ایڈیشن چھپ سکتے ہیں اور مصنفوں کی پریشانی بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ اس ملاقات کے لیے ہمیں پانچ سات منٹ ملے تھے لیکن یہ گفتگو تیس منٹ تک پھیل چکی تھی۔ ہمیں اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ یہ کہہ کر کہ آج آپ بہت مصروف ہیں۔ ہم رخصت طلب ہوئے۔ باہر آئے تو صدر کانگریس شری دھیبر بھائی موجود تھے۔ ان سے معذرت کی کہ ہماری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی وہ بولے نہیں، اس دربار میں شاعروں اور ادیبوں کو سیاست دانوں پر ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ تھی مولانا مرحوم سے میری آخری ملاقات جو آج بھی میری نظروں کے سامنے اس طرح موجود ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

اور اس کے بعد ۲۹ فروری ۱۹۵۸ء کی صبح کو میں نے دور سے مولانا کے جسدِ فانی کو پھولوں سے لدا ہوا دیکھا، جب لاکھوں ہندوستانیوں اور غیر ملکیوں کا ہجوم اسے فوجی گاڑی میں لٹا کر اس منزل کی طرف لے جا رہا تھا جہاں ہر انسان کو ایک دن پہنچنا ہے۔

میری نظر کے سامنے لاکھوں انسانوں کا زار و قطار روتا ہوا ہجوم تھا۔ ریڈیو کا مبصر رندھی ہوئی آواز میں مولانا کے آخری سفر کی روداد سنا رہا تھا اور میرا دل علامہ اقبال کے

ان اشعار کی جانب کھنچا جا رہا تھا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عشق کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

نئی دہلی

۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء

عبد المجید سالکؔ

مولانا عبد المجید سالک کے انتقالِ پُرملال کی خبر مجھے ٹیلی فون پر خوشتر گرامی موسس
ایڈیٹر بیسویں صدی (نئی دہلی) نے سنائی اور اس طرح کہ شدتِ گریہ کے باعث ان کے
منہ سے لفظ تک نہیں نکل رہا تھا۔ گھگی بندھی ہوئی تھی۔ بہ مشکل انھوں نے بات کی اور
اپنے سالنامے کے لیے مجھ سے میرے تاثرات نظم میں قلم بند کرنے کو کہا۔

میں نے انتہائی فرطِ الم کے عالم میں دوسرے روز انھیں حسبِ
ذیل خط لکھا۔ (جگن ناتھ آزاد)

ڈی ۲، اے ۶۰، رنگ روڈ موتی باغ، نئی دہلی

۲۹ر ستمبر ۱۹۵۹ء

محترمی خوشتر صاحب، تسلیم

کل صبح ٹیلی فون پر آپ نے وہ قیامت آفریں خبر سنائی کہ ابھی تک نہ دل ٹھکانے
ہے نہ دماغ۔ قبلہ سالک صاحب کو نظم میں خراجِ عقیدت ادا کرنے کی فرمائش سر آنکھوں
پر لیکن غم کی اس قدر فراوانی میں طبیعت شعر گوئی پر مائل ہو بھی تو کیسے۔ میں خود اس لمحے کا منتظر
ہوں جب اپنے امیرِ کارواں کے حضور میں اپنا اظہارِ ارادت اشعار کے ذریعے سے کر سکوں
وہ نظم یقیناً "بیسویں صدی" کی نذر کروں گا۔ اس کے لیے کچھ وقت گزرنا لازمی ہے، اگرچہ

اس زخم کا اندمال قیامت تک ممکن نہیں ہے۔

اس وقت تو میری نظر کے سامنے گزشتہ بائیس برس کی مدت اس طرح سمٹ کر آگئی ہے جیسے پردہ سیمیں پر کوئی فلم چل رہا ہو۔ یہ کوئی آج سے بائیس برس پہلے کی بات ہے۔ میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی، راولپنڈی میں ہم لوگ رہتے تھے۔ میں اس زمانے میں گارڈن کالج میں پڑھتا تھا کہ عبدالعزیز فطرت ایک دن دوپہر کو کالج میں آئے اور مجھ سے کہنے لگے مولانا عبدالمجید سالک آج لاہور سے تشریف لائے ہیں۔ وہ مرحوم صاحب سے ملنے شام کو آپ کے گھر آئیں گے۔ والد صاحب سے کہہ دینا کہ شام کو گھر ہی پر رہیں۔ اس وقت تک میں سالک صاحب کے نام سے "انقلاب" کے "افکار و حوادث" ہی کے ذریعے سے آشنا تھا۔ ان کے کلام یا ان کی ذات سے واقفیت نہیں ہوئی تھی۔ میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا کہ فطرت صاحب کے اس پیغام سے مجھے کتنی خوشی ہوئی جس ادیب کی شگفتہ تحریریں ساری دنیائے اردو کے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر رہی ہیں۔ وہ آج ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ میں پھولا نہ سمایا۔

شام کو سالک صاحب اور فطرت صاحب حسبِ وعدہ تشریف لائے اور کوئی دو گھنٹے کے قریب وہیں رہے۔ علم و ادب، شاعری، صحافت، لاہور کے قصے، راولپنڈی کی باتیں، سیاست، اردو کا مستقبل، مشترکہ احباب کا ذکر، غرض ہر موضوع پر بات چیت ہوتی رہی میری حیثیت تو اس بات چیت میں ایک سامع ہی کی تھی۔ ویسے بھی یہ بات چیت تقریباً اس طرح کی بات چیت تھی جیسے ریڈیو کی بات چیت ہوتی ہے۔ یعنی قریب قریب یک طرفہ تھی۔ سالک صاحب ہی ہر موضوع کو شروع کر کے اسے انتہا تک پہنچا رہے تھے۔ دورانِ گفتگو میں ان کے لطائف اس مختصر سی محفل کو زعفران زار بنا رہے تھے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کا ذکر آیا تو والد محترم نے کہا کہ سالک صاحب تاجور صاحب کے ساتھ کشمکش جاری ہے یا ختم ہوگئی؟ اب اسے ختم ہی کر دیجیے تو سالک صاحب نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر کہا کہ ان کی طرف سے "کش" ہو گی میری طرف سے تو "مکش" ہی ہے۔ اس پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ یہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی بات چیت کیا تھی ہماری ادبی تاریخ کا ایک دل چسپ باب تھا۔ کاش اس وقت مجھے اتنی سمجھ ہوتی کہ میں اس ساری گفتگو کو قلمبند کر لیتا۔ میں تو اسی بات میں خوش ہو کر رہ گیا کہ سالک صاحب ہمارے یہاں تشریف لائے ہیں۔

چند ماہ بعد میں گارڈن کالج سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم اے میں داخل

ہونے کے لیے لاہور پہنچ گیا لیکن آکر ایم ۔ اے میں داخل ہونے کی بجائے کوئی ایک برس "آوارہ"
پھرتا رہا ۔ اس آوارگی کے دوران میں سالک صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا کئی بار موقع
ملا ۔ اس حاضری کی وجہ کچھ تو سالک صاحب سے میری ارادت تھی اور کچھ عبدالسلام خورشید
کی قربت ۔ سالک صاحب کا دولت خانہ شہر سے دور مسلم ٹاؤن میں تھا ۔ وہاں جانے
کی صورت کم پیدا ہوئی ۔ دفتر ان کا یعنی دفتر "انقلاب" شہر کے مرکز میں تھا ۔ وہی میرا
کعبۂ مقصود بن گیا ۔ میری تو خیر بساط کیا تھی ۔ بارگاہِ سالک میں بڑے بڑے فن کار باادب
بن کر آتے تھے اور با خبر بن کر جاتے تھے ۔ جب کبھی ہری چند اختر تشریف لاتے تو ان کی اور
مولانا سالک کی گفتگو ہمارے ادبی طنز و مزاح کا ایک شاندار باب بن جاتی تھی لیکن
افسوس کہ یہ سب تقریری ادب اس وقت پھلجڑی بن کے اڑ چکا ہے ۔ نہ ہری چند اختر
اس وقت باقی ہیں اور نہ عبدالمجید سالک ع

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

لاہور میں میرا جی مرحوم کی قیادت میں حلقۂ اربابِ ذوق کی بنیاد پڑی تھی اور کچھ
مدت بعد دارالعلوم الشرقیہ میں محترم آغا بیدار بخت نے حلقہ اربابِ علم قائم کیا تھا ۔ ان
دونوں حلقوں میں نظریاتی اختلاف بھی تھا اور ذاتی بھی ۔ لیکن سالک صاحب کی شخصیت
اتنی بلند تھی کہ یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے اجلاس کی صدارت کے لیے اکثر سالک صاحب
کی محتاجِ عنایت رہتی تھیں ۔ ایک دن ان دونوں حلقوں کا ذکر کرتے ہوئے قبلہ سالک
صاحب نے فرمایا :

" لاہور میں اس وقت دو ادبی حلقے ہیں ایک حلقۂ اربابِ ذوق جس میں علم
کی کمی ہے اور دوسرا حلقۂ اربابِ علم جس میں ذوق کی کمی ہے ۔ "

اب اس فقرے میں جو نکتہ پوشیدہ ہے اس سے کچھ وہی حضرات لطف اندوز
ہو سکتے ہیں جو ان انجمنوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے وابستہ رہے ہوں ۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کافی ہاؤس میں بعض ادیبوں نے سالک صاحب کو گھیر لیا
اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کرنے لگے ۔ سالک صاحب میں اپنا کلام سنانے کی کمزوری
مطلقاً نہیں تھی ۔ وہ بہت دیر تک تو اپنی خوش گفتاری سے ان کی فرمائش کو ٹالتے رہے ۔ آخر
جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو یہ شعر پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ؎

"مسافر غریب ایک رستے میں تھا
وہ چوروں کے ہاتھوں میں جا کر پھنسا"

یہ تو خیر ان کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو یعنی خالص علمی، ادبی اور کلاسیکی پہلو بھی اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ روشن اور تابناک تھا۔ اگرچہ اس میں بھی وہ ظرافت اور مزاح کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ تحریک آزادی کے دنوں میں آپ دوسرے لاکھوں سرفروشانِ وطن کی طرح قید و بند کی صعوبتوں سے آشنا ہوئے۔ جس زمانے میں وہ جیل میں تھے ان کے دوستوں حفیظؔ جالندھری، پنڈت ہری چند اخترؔ، صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ اور ڈاکٹر تاثیرؔ نے ان کا مجموعۂ کلام ان کی غیر حاضری میں چھپوایا اور مصنف کے تخلص کی مناسبت سے اس کا نام رکھا۔ "راہ و رسمِ منزل ہا"۔ سالکؔ صاحب جیل سے رہا ہو کر آئے تو مجموعۂ کلام دیکھ کر اپنے احباب سے کہنے لگے جب کتاب کا اتنا طویل نام ہی تجویز کرنا تھا تو پورے مصرعے "کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزل ہا" میں کیا خرابی تھی۔ دوستوں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ سوچا تو ہم نے بہت لیکن کوئی موزوں مختصر نام سامنے آیا ہی نہیں۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا "کلامِ مجید" نام رکھ دینا تھا (یہ جملہ یہاں "نقل کفر کفر نہ باشد" کے مصداق نقل کیا جا رہا ہے)

خوشترؔ صاحب! پھر میں نے انھیں علمی مجلس کی صدارت کرتے بھی دیکھا ہے اور ان میں گہرے علمی موضوعات پر انھیں فی البدیہہ تقریریں کرتے بھی سنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں لفظ و معنی کے ایک پرسکون و متین سمندر کے کنارے بیٹھا ہوں۔

غالباً ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ کراچی میں حلقۂ ارباب ذوق کا سالانہ جلسہ تھا۔ مجھے اگرچہ محض مشاعرے میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا لیکن میں ایک دن پہلے کراچی جا پہنچا اور مقالات اور تقریروں کے پروگرام میں بھی ایک سامع کی حیثیت سے شریک ہوا۔ جس نشست کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں مباحثے کا موضوع "فن برائے فن یا برائے زندگی" تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے صدارت ڈاکٹر محمود حسین خاں کر رہے تھے۔ تقریباً تمام مقررین نے اس مباحثے میں موضوع پر بات کرنے میں کم اور اپنی قابلیت کے اظہار میں زیادہ حسنِ طلاقت سے کام لیا۔ آخر میں صاحب صدر نے سالکؔ صاحب سے فرمائش کی۔ آپ نے جن فقروں سے ابتدا کی وہ اب مجھے لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں ہوں گے لیکن ان کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

"مجھ میں ایک نقص یہ ہے کہ دیئے ہوئے موضوع ہی پر تقریر کرتا ہوں نہ جانے میری تقریر کا آپ کیا اثر لیں کیونکہ آپ بڑی دیر سے ایسی تقریریں سن رہے ہیں جن کا موضوع سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا ......

"فن برائے زندگی اور فن برائے فن" کے موضوع پر چند فقروں میں آپ نے یہ نکتہ حاضرین کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ فن ہمیشہ زندگی کے لیے ہوتا ہے۔ "فن برائے فن" پر بھی ہم جب غور کرتے ہیں تو انجام کار اس کا مقصد بھی یہی سامنے آتا ہے کہ وہ زندگی ہی کے لیے ہے۔ علوم ہوں یا فنون یہ سب زندگی ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوں، آپ فن برائے فن ایسی مہمل بات کیوں لے بیٹھے ہیں۔ آج تک ہم نے کبھی یہ نہیں سنا کہ سائنس برائے سائنس، تاریخ برائے تاریخ یا جغرافیہ برائے جغرافیہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آخر صرف فن برائے فن ہی کیوں ہو۔ فن برائے فن تو ایک ایسا نعرہ تھا جو فرانس میں خاص سیاسی ضرورتوں کے تحت بلند کیا گیا تھا اور اس وقت ایسے ہی نعرے کی ضرورت تھی ......"

کراچی میں یہ ان سے پہلی ملاقات تھی اس کے بعد کراچی میں ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء تک ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس دوران میں آپ دہلی کے انڈو پاکستان مشاعروں میں اکثر تشریف لائے۔ آپ کو یاد ہوگا ایک بار ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس میں آپ پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے آئے تھے ان کی بدولت دہلی کی ادبی سرگرمیوں میں جان آگئی تھی۔ جب تک وہ یہاں رہے ان کے اعزاز میں ادبی صحبتوں کا ایک تانتا بندھا رہا۔

کراچی کے ذکر سے نہ جانے کتنے واقعات میرے تصور میں ابھر رہے ہیں۔ کیا سناؤں کیا نہ سناؤں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی گولڈن جوبلی کے دنوں کی بات ہے۔ مشاعرے سے قبل ملاقات ان سے اس دعوت میں ہوئی جو قبلہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے انجمن کے وسیع لان میں باہر سے آنے والے شعراء اور مقررین کے اعزاز میں دی تھی۔ حضرت جوش ملسیانی سالک صاحب راقم التحریر اور مجید لاہوری ایک ہی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں رات کو مشاعرے میں نہ آسکوں گا۔ تم جو غزل مشاعرے میں پڑھو وہ مجھے کل آ کے سنا دینا۔ میرے لیے ان کی یہ محبت بہت بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ میں نے کہا میں ضرور حاضر ہوں گا۔ غزل سنانا تو اتنا ضروری کیا ہے، حاضر ہونا ضروری ہے۔ لیکن اتفاق کی بات کہ اس مشاعرے کے دوسرے ہی دن مجھے راولپنڈی کے ایک مشاعرے

میں شرکت کے لیے اچانک کراچی سے روانہ ہونا پڑا۔ اب جو راولپنڈی سے واپس آیا اور سالک صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں خلاف مزاج ناراض پایا۔ میں نے عرض کیا کہ اچانک ہی اپنے استاد پروفیسر محمد اعظم کا تار ملنے پر مجھے راولپنڈی جانا پڑا تو وہ کہنے لگے کیوں غلط بات کہہ رہے ہو۔ انجمن کے مشاعرے کے تین دن بعد تک تم یہیں تھے اور ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ میں نے یہیں لاؤڈ سپیکر پر تمھاری آواز اور غزل سنی ہے۔ مجید لاہوری اتفاق سے میرے ساتھ تھے۔ وہ اپنے انداز میں سالک صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ "بھولیو[1] کی گلاں کرن رہے او۔ جگن تاں دوئے دن پنڈی چلا گیا سی۔ او تاں انجمن والا مشاعرہ کراچی ریڈیو نوں ریلے ہو رہیا سی۔ اے تاں اُس ویلے تک پنڈی پہنچ گیا ہونے۔ اے کدی ہو سکدے کہ جگن کراچی وچ ہو وے تے تواڈے کول نہ آوے۔ میں تو اس دوران میں خاموش رہا۔ لیکن فی الفور سالک صاحب کے چہرے پر غصے اور ناراضی کی جگہ اطمینان اور مسرت کی چمک پیدا ہوگئی اور بولے ہاں میں[2] وی ای کہندا ساں کہ اے گل ہو تاں نہیں سگدی۔ آج جب کہ سالک صاحب کی یاد میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں مجید لاہوری کی بھی محض یاد ہی باقی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

موت نے کس امید پر سونپ دیئے ہیں بحر و بر
مشتِ غبار ہے بشر، مشتِ غبار کیا کرے (حفیظ)

یہ تو ان کی خوردوں کے ساتھ بزرگانہ شفقت کی محض ایک جھلک تھی۔ میری تو یادداشت ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" والا معاملہ ہے۔ کراچی کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ میں سالک صاحب کے یہاں حاضر تھا۔ ایک اور شاعر بھی جن کا نام میں یہاں نہیں لکھ رہا، وہاں موجود تھے۔ وہ ان سے اپنے مجموعۂ کلام کا دیباچہ لکھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اور سالک صاحب اپنی مصروفیت کا عذر پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے بہت کہا لیکن

---

[1] "بھولیو" مجید لاہوری کا تکیۂ کلام تھا۔ اس لفظ کا ترجمہ تو مشکل ہے۔ باقی فقروں کا ترجمہ یہ ہے۔ "آپ کیا فرما رہے ہیں۔ جگن تو دوسرے دن راولپنڈی چلا گیا تھا۔ وہ تو انجمن کا مشاعرہ تھا جو کراچی ریڈیو سے ریلے ہو رہا تھا۔ یہ تو اس وقت تک راولپنڈی پہنچ بھی چکا ہوگا۔ یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ جگن کراچی میں ہو اور آپ کے پاس نہ آئے۔ [2] ہاں میں بھی یہی کہتا تھا کہ یہ بات ہو تو نہیں سکتی۔

آپ نہ مانے اور کہا کہ میں ان دنوں بے حد مصروف ہوں ۔ وہ صاحب مایوس ہو کر چلے گئے، تو میں نے ڈرتے ڈرتے گزارش کی کہ ایک مدت سے میری یہ آرزو ہے کہ میرے کسی مجموعۂ کلام کا دیباچہ آپ لکھیں لیکن اب اس تمام گفتگو کے بعد جو آپ کی ان صاحب کے ساتھ ہوئی ہے، میں یہ بات کیسے آپ سے کہہ سکتا ہوں۔ کہنے لگے تمہارے مجموعۂ کلام کا دیباچہ میں ضرور لکھوں گا۔ مصروف میں ہوں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ تمہاری کتاب کا دیباچہ بھی نہ لکھوں گا۔ تم آج ہی اپنا مسودہ مجھے بھجوا دو تا کہ تمہارے دہلی جانے سے پہلے دیباچہ مکمل ہو جائے۔ میرے پاس اس سفر میں "وطن میں اجنبی"، کا مسودہ موجود تھا۔ وہ میں نے انھیں لا کر دے دیا اور تیسرے یا چوتھے دن جب ان سے ملنے گیا تو دیباچہ لکھا ہوا موجود تھا۔ یہ دیباچہ — سالک صاحب کے ہاتھ کی گراں مایہ تحریر — جس پر ۲۵ راکتوبر ۱۹۵۳ء کی تاریخ پڑی ہے ایک ادب پارے کے طور پر ہی نہیں بلکہ ایک ذاتی قیمتی یادگار کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے اور کراچی میں سالک صاحب کے ساتھ ملاقاتوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

سالک صاحب نے تقسیم ہند کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود زبان اور ادب کی تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ہندو تمدن اور مسلم تمدن کی، وہ تصویر ان کے ذہن میں تھی جس کی تشکیل میں ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت نے اپنے تمام ذرائع صرف کر دیئے تھے لیکن وہ ہندو تمدن اور مسلم تمدن کو اس طرح سے ایک تمدن بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جس طرح سے ہندوستان کی ایک اور سیاسی جماعت نے ان دونوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس نازک مسئلے پر ان کے خیالات ضرورت اور مصلحت کی بجائے حقیقت پر مبنی تھے۔ وہ ہندو مسلم تمدن کو الگ الگ صداقتیں تصور کرنے کے باوجود انھیں ایک دوسرے کے صحت مند اثرات سے آزاد نہیں سمجھتے تھے اگر مجھ پر یہ الزام عائد نہ ہو کہ میں نے اس تحریر میں سالک صاحب کے ذکر کی بجائے اپنا ذکر شروع کر دیا ہے تو میں 'وطن میں اجنبی' کے دیباچے میں سے ایک پیراگراف اپنے اس خیال کی تائید میں یہاں نقل کرنا چاہوں گا جس میں سالک صاحب لکھتے ہیں :

" بلاشبہ دونوں طرف کے باشندوں نے سیاسی احساسات کے زیر اثر ایک دوسرے کے گلے کاٹے۔ ایک دوسرے کی آبرو ریزی کی۔ ایک دوسرے کا مال لوٹا اور ایسی ناقابلِ تصور حرکات کا ارتکاب کیا۔ جس پر انسانیت ہمیشہ خون کے آنسو روتی رہے گی لیکن اس

حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سارے ہندو سارے مسلمان اور سارے سکھ درندے نہیں تھے۔ ان قوموں میں ایسے افراد بھی تھے جن کے قلوب محبت و دردمندی سے لبریز تھے۔ وہ اختلاف رائے کے باوجود اپنے باپ دادا کے وطن سے پیار کرتے تھے۔ اپنے ہمسایوں پر بھائیوں کی طرح سے نثار ہوتے تھے اور ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے اچھی باتیں اخذ کرنے میں وسیع المشربی اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ وہ ہرگز اپنے آبائی وطنوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کو صرف حالات نے نقل مکانی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ وہ مہاجر اور شرنارتھی ہونے کی حالت میں بھی اپنے دلوں کو اپنے قدیم وطنوں کی یاد سے لبریز پاتے ہیں اور جب کبھی ان کو وہ پرانے تعلقات اور روابط یاد آتے ہیں جن کے سائے میں انھوں نے جنم لیا تھا اور پروان چڑھے تھے تو ان کے دلوں پر چوٹ لگتی ہے۔ اور وہ بے اختیار اشکبار ہو جاتے ہیں۔ بے شک سیاسی و عقلی اعتبار سے انھیں اب سینے پر صبر کی سل رکھ کر ماضی کو فراموش کر دینا اور اپنے نئے وطن سے وابستہ ہو جانا چاہیے کیونکہ گزرا ہوا زمانہ اب واپس نہیں آئے گا لیکن جذبات پر عقل و خرد کی حکمرانی کب ہوئی ہے۔ کم از کم موجودہ نسل تو غمِ مافات کی آہوں اور یادِ ماضی کے آنسوؤں سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ البتہ نئے ماحول میں پرورش پانے والی آئندہ نسلیں اس دردناک تاریخ سے بے پروا ہو جائیں تو ہو جائیں۔"

کراچی کی ملاقاتوں میں علامہ اقبال کا ذکر سالک صاحب کے ساتھ بات چیت کے دوران میں آیا اور انھوں نے مجھے اقبال کے وہ نادر اور غیر مطبوعہ اشعار سنائے جو اقبال کی مطبوعہ تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔ میں 'ان نوادرِ اقبال' کو جو قبلہ سالک صاحب کے ذریعے سے مجھ تک پہنچے ہیں آج بھی اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہوں، جہاں میں اس بات پر نازاں ہوں کہ آج میری بیاضیں اقبال کی ان نظموں اور غزلوں سے مملو ہیں جو اقبال کی مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں، وہاں اس بات پر میری حیرانی اپنی جگہ بدستور ہے کہ سالک صاحب کو اقبال کا کتنا کلام زبانی یاد تھا۔ جلیانوالا باغ، امرتسر کے حادثے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے مجھے اقبال کا یہ قطعہ سنایا۔

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ	غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم	تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر علامہ اقبال نے جو نظم کہی وہ میں سالک صاحب ہی کے خزانۂ یادداشت کی زکوٰۃ کے طور پر آپ تک پہنچا رہا ہوں ؎

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ — تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گزشت
اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم — از کنارِ اندلس وز ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت — سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست — بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

"نیا شوالہ" اقبال کی مشہور نظم ہے "ترانہ ہندی" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ کے بعد اسی نظم کو ہندوستان بھر میں قریباً اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ یہ نظم "بانگِ درا" میں موجود ہے۔ اس کے یہ اشعار جو "بانگِ درا" میں نہیں ہیں سالک صاحب ہی کے ذریعے سے مجھے حاصل ہوئے ہیں۔ :

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا — بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو — اس ہر دوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں
سندر رہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو — اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں
زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو — یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں، درشن ہو عام اس کا — ہر آتما کو گویا اِک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اس سے پانی — اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں
"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے — بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو — آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے ایک نرگن کہتے ہیں دوست جس کو — دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا، ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

آخر کہاں تک نقل کرتا چلا جاؤں وہ فکر و معانی کے، علم و ادب کے، فن گفتگو کے ایک بحرِ بے کنار تھے۔ ان کے ساتھ تو جتنی ملاقاتیں ہوئیں کم تھیں اور گزشتہ بیس برس میں یہ ملاقاتیں تھوڑا ہی تھیں یہ تو ایک جلوہ بے پایاں کی محض ہلکی سی جھلک تھی جسے ملاقاتوں کا نام دے

کر میں شاید اپنے ہی جذبۂ انا کی تسکین کر رہا ہوں ؎

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

اس خط کو ختم کرنے سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ اور بیان کروں گا جو شاید سالک صاحب کی بلند کرداری، وسیع المشربی کی منہ بولتی تصویر نظر آئے۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کے دنوں کی بات ہے۔ پنجاب میں جو کچھ اس زمانے میں ہوا اسے دہرانا بے کار ہے۔ آپ کے تو سامنے کی بات ہے کہ لاہور ایک جہنم زار بنا ہوا تھا۔ میں لاہور میں تھا اور والدین راولپنڈی میں۔ وہ چونکہ گارڈن کالج میں پروفیسر ریورینڈ جے بی کننگس کے مکان پر منتقل ہو گئے تھے اس لیے نسبتاً محفوظ تھے۔ میرا انھیں کچھ پتہ نہ چل سکا کہ میں کہاں ہوں اور مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ چنانچہ والد نے انتہائی اضطراب میں سالک صاحب کو خط لکھا کہ جیسے بھی ہو وہ میرا پتہ چلائیں اور میری خیریت سے انھیں اطلاع دیں۔ اس کے جواب میں سالک صاحب نے ۲۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور سے انھیں جو خط لکھا وہ ایک نظر دیکھیے گا۔

بزرگوارم آداب۔ آپ کے دو خط اور فطرت صاحب کا ایک کارڈ مل گئے۔ میں نے بالکل احتیاط کے خلاف خود رام نگر جا کر تحقیق کی لیکن عزیزی آزاد کا پتہ نہ چلا۔ کوئی بتانے والا بھی نہ ملتا تھا اور جو ملے انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میرا خیال ہے کہ یا تو کسی خالص ہندو آبادی میں محفوظ ہیں یا لاہور سے کہیں باہر جا چکے ہیں۔ لیکن بہر حال انھیں چاہیے تھا کہ اپنے مقام سے آپ کو اطلاع دیتے۔ آج میں نے ریڈیو والوں سے کہا ہے کہ وہ پیغام نشر کریں کہ جگن ناتھ آزاد جہاں بھی ہوں وہ محروم صاحب کو اطلاع دیں۔ پیغام نشر ہونے کے بعد میرا خیال ہے کہ آزاد کا کوئی دوست جسے ان کا علم ہوگا ضرور اطلاع دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس عزیز کو بہمہ وجوہ سلامت رکھے اور آپ کے کلیجے میں جلد از جلد ٹھنڈک ڈالے۔ میں انشاء اللہ اس کی تلاش سے غافل نہ رہوں گا۔

سالک

جس تاریخ کو سالک صاحب نے والد محترم کو یہ خط لکھا اس دن میں دہلی کا چکر لگا نے اور پہلے جناب منور لکھنوی اور پھر برادر محترم عرش ملسیانی کے ہاں ہفتہ عشرہ قیام کرنے کے بعد دہلی میں مقیم نہ ہونے کا قریباً قطعی فیصلہ کر کے لاہور واپس پہنچ چکا تھا۔ عین اسی دن جب

سالک صاحب کے خیال کے مطابق مجھے کسی خالص ہندو آبادی میں محفوظ ہونا چاہئے تھا، میں ملتان روڈ پر ابو ظفر نازش رضوی کے مکان پر مقیم تھا اور وہاں کی خالص مسلم آبادی کے مہمانِ عزیز کی طرح فروکش تھا۔ میں نے اپنے بارے میں سالک صاحب کا نشری پیغام لاہور میں سنا۔ اپنی خیریت کی اطلاع میں نے والدِ محترم کو ڈاک، تار اور ٹرنک کال کے ذریعے سے دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس زمانے میں یہ تمام راستے مسدود تھے اور اگر کھلے بھی تھے تو مجھ ایسے ہر کس و ناکس کے لیے نہیں بلکہ اونچے طبقے کے لیے۔ یہاں چند روز قیام کرنے کے بعد میں محترم خان بہادر ملک خدا بخش کے مخلصانہ مشورے پر ہندوستان ہی میں بود و باش اختیار کرنے کے ارادے سے پھر عازمِ دہلی ہوا اور پھر عرش صاحب کے یہاں آ کے ڈیرے ڈال دیئے جہاں پنڈت ہری چند اختر مجھ سے پہلے قیام پذیر تھے۔ اپنے بارے میں سالک صاحب کا دوسرا نشری پیغام اور پھر حفیظ جالندھری کا پیغام مجھے یہیں دہلی میں ملا۔ ان پیغامات کے جواب میں میری خیریت کی اطلاع عرش صاحب ہی نے ریڈیو پر والدِ محترم، حفیظ صاحب اور سالک صاحب کو بھجوا دی۔

خوشتر صاحب، میں اس خط میں اتنا کچھ کیوں لکھ گیا یہ مجھے خود نہیں معلوم۔ کل صبح اور پھر دوپہر کو آپ ٹیلیفون پر جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے ہیں اس میں مجھے اس دور کے خلوص و محبت کی ایک تابناک تصویر نظر آئی ہے جو اس وقت بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ آج کا دور تو تجارتی ذہنیتوں کا دور ہے۔ اس میں آپ کی محبت اور اخلاص کی کیا قیمت؟ حفیظ صاحب نے کیا عمدہ کہا ہے۔ ؎

بازار نیا، گاہک بھی نئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں

آپ کی فریاد و زاری کے جواب میں میرے لیے یہاں کوئی حرفِ تسلی لکھنا تو چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہو گا۔ جس صدمے سے آپ دوچار ہوئے ہیں، اس کے لیے امتدادِ وقت کے سوا اور کوئی حرفِ تسلی نہیں ہے۔ نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اس جانکاہ صدمے پر خورشید کو تعزیت کا خط لکھ سکوں۔ محترم صلاح الدین احمد کی بیگم کے انتقال کو کئی ماہ گزر گئے ہیں، میں صلاح الدین صاحب کو ابھی تک تعزیت کا خط نہیں لکھ سکا اور نہ ہی لکھ سکتا ہوں۔ ان منزلوں سے گزرنا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے اس موقع پر علامہ اقبالؒ کے چند اشعار یاد آ رہے ہیں، وہ یہاں نقل کر رہا ہوں۔ ممکن ہے یہ اشعار آپ کے زخم پر مرہم کا کام کر سکیں:-

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور — گر کے وادی کی چٹانوں سے یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے — یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی — گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو — یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر — راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت بن گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر — فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو — جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

غلام مصطفیٰ تبسم

لختِ دلِ پُرخونے از دیدہ فرو ریزم

کل رات جب میں یونی ورسٹی سے گھر آیا تو میری بیوی نے مجھے بتایا کہ آپ کے استاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا انتقال ہو گیا ہے۔

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے بے اختیاری کے عالم میں پوچھا، "کیا ریڈیو پر خبر آئی ہے؟" اس نے کہا "ابھی تھوڑی دیر قبل پاکستان ٹیلی ویژن نے بتایا ہے۔" میں رنج و غم کے طوفان میں ڈوب گیا۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صرف میرے استاد ہی نہیں تھے بلکہ میرے ایسے اساتذہ میں تھے جن کے ساتھ میرا ہمیشہ ایک تعلق خاطر رہا۔ اس تعلق خاطر کی بنیاد تو یہ تھی کہ وہ میرے والدِ محترم کے دوستوں میں سے تھے۔ دراصل لاہور کا یہ سارا ادبی گروپ جس کے ممتاز ترین ارکان حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری، سید عابد علی عابد اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم تھے، والد کا قدردان اور مداح تھا اور ان سب کے ساتھ والد کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان تمام حضرات میں حفیظ جالندھری شاعری کی بنا پر اور سید عابد علی عابد اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم فارسی کی بنا پر والد سے بہت قریب رہے۔

صوفی صاحب کے ساتھ میرے اس تعلق خاطر میں اضافہ اس وقت ہوا جب میں نے ایم اے میں داخلہ لیا اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر علم الدین سالک اور سید عابد علی عابد کے ساتھ ہی میں نے صوفی غلام مصطفیٰ کے سامنے بھی زانوے ادب تہ کیا۔

ملاقاتیں اس سے قبل مشاعروں میں ہو چکی تھیں لیکن ان مشاعروں میں صوفی صاحب مرحوم کے ساتھ قرب زیادہ نہ بڑھنے پایا کیونکہ میں اکثر مشاعروں میں اپنے استاد مولانا تاجور نجیب آبادی کے پیچھے بیٹھتا تھا اور صوفی صاحب حفیظ جالندھری کے دوست ہونے کی وجہ سے ان کے قریب بیٹھتے تھے۔ اس زمانے میں مشاعرون میں بیٹھنے کے آداب بھی ہوتے تھے۔ شاگرد اپنے استاد کے پیچھے ہی بیٹھتے تھے اور مولانا تاجور اور حفیظ جالندھری کے درمیان جو فاصلہ حائل تھا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

میں ایم۔ اے میں داخل ہوا۔ صوفی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبہ فارسی تھے۔ وہ ہمیں فارسی شاعری پڑھاتے تھے۔ درسی کتب کی تعداد خاصی تھی اور صوفی صاحب نے ابتدا غزلیاتِ نظیری سے کی۔ امتحان سر پر آگیا اور نظیری کی صرف چند ہی غزلیں ختم ہوئی تھیں۔ سارا کورس باقی تھا لیکن یہ چند غزلیں انھوں نے ہمیں اس طرح پڑھائیں کہ فارسی شعر و ادب کا مذاق ہم طالب علموں کے رگ و پے میں رچ گیا۔ بعض دفعہ ایک شعر کی تشریح میں سارا پیریڈ صرف ہو جاتا تھا۔ اس درس و تدریس کے دوران میں یہ راز مجھ پر کھلا کہ مقررہ مدت کے اندر کورس کی کتاب کو اول سے آخر تک گھسیٹ کے لے جانے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ شاگرد میں مفہوم کی تہ تک پہنچنے اور شعر و ادب سے لذت اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ صوفی صاحب کے طریقۂ تعلیم میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود تھی۔

انھوں نے پہلے ہفتے ہی میں اس بات کا جائزہ لے لیا کہ ان کی کلاس میں کون کون سے طلبہ موزوں طبع ہیں اور کون کون سے ناموزوں طبع۔ قریباً سب ہی موزوں طبع تھے۔ چنانچہ ایک دن جب آپ ہمیں "نظیری" کی یہ غزل

به هر نرخے که می گیرند کالائے وفا خوب است\
پس از مدت گزر افتاد بر ما کاروانے را

پڑھا چکے تو کہنے لگے آپ سب حضرات اس زمین میں غزل کہیے۔ غزل کہنے کے لیے آپ کو ایک ہفتہ دیا جاتا ہے۔ آئندہ ہفتے کلاس روم میں مشاعرہ ہوگا جس میں آپ سب اسی طرح میں اپنی اپنی غزلیں سنائیں گے۔

نظیری کی زمین میں غزل کہنا! الہٰی توبہ۔ میں نے تو صوفی صاحب کا ارشاد سنتے ہی ہمت ہار دی۔ صرف یہی نہیں کہ نظیری کی اس قدر بلند پایہ غزل میری ہمت شکنی کے لیے سامنے

تھی بلکہ اس زمین میں اقبال کی غزل

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

نظیری کے پائے ہی کی بلکہ نظیری کی غزل سے بھی کچھ زیادہ بلند مرتبہ موجود تھی۔ یہ شعر اقبال کی اسی غزل میں ہے۔

کجا نورے کہ غیر از قاصلی چیزے نمی داند
کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

اب ان اشعار کے بعد ہم میں سے کس کی مجال تھی کہ اس زمین میں طبع آزمائی کرتا۔

لیکن ہم طلبہ میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ اس زمین میں غزل کہیں اور مشاعرے میں پڑھیں۔ فارسی شاعری ان کے بس کا روگ نہیں تھی۔ تین چار دن گزر گئے اور ایک مصرع بھی اُن سے نہ ہو سکا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "یار آزاد! مجھ سے تو اس زمین میں غزل نہیں ہو رہی ہے۔ تم نے کہہ لی؟" میں نے ڈینگ ماری اور کہا "ہاں، میرے لیے فارسی غزل کہنا کیا مشکل ہے۔ میں تو سات شعر کی غزل کہہ چکا ہوں، لیکن مشاعرے سے پہلے کسی کو سناؤں گا نہیں۔" بولے "یار، چند شعر مجھے بھی کہہ دو" میں نے کہا "آؤ بیٹھو، فی البدیہہ کہہ دیتے ہیں۔" اب میں شرارت پر آمادہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شعر کی پرکھ ان حضرت کو نہیں ہے۔ دس پندرہ منٹ میں ایک مہمل اور بے معنی غزل کہہ کے انھیں دے دی۔ وہ اسے پڑھ کے بہت خوش ہوئے۔ غالباً انھوں نے مہمل اشعار کو کسی تہ در تہ معنویت کا حامل سمجھا۔ اس غزل کا مطلع یہ تھا:

بہ بیں اے معترض اوجِ کمالِ بے زبانے را
ز رومی مثنوی گیر از سعدی بوستانے را

باقی اشعار بھی ایسے ہی اوٹ پٹانگ اور لغو قسم کے تھے۔ شاید ایک دو اور بھی مجھے یاد آجائیں۔ آخر کلاس روم کے مشاعرے کی تاریخ آگئی۔

صوفی صاحب نے کلاس روم میں آتے ہی پوچھا۔ "کہیئے غزلیں کہہ کے آپ لوگ لے آئے؟" کلاس میں ایک سناٹا چھا گیا صوفی صاحب نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا "صوفی صاحب، ہمت نہیں ہوتی۔ اس زمین میں ایک نہیں دو حوصلہ شکن غزلیں موجود ہیں۔" وہ شاعر صاحب فوراً بولے "جی ہاں میں نے غزل کہی ہے۔" انھی کو حکم ہوا کہ تمھیں ابتدا کرو۔

بہ بیں اے معترض اوجِ کمالِ بے زبانے را
ز رومی مثنوی گیر و ز سعدی بوستانے را

کلاس روم میں بعض چہروں پر ہنسی نمودار ہوئی۔ صوفی صاحب نے عالم حیرت میں شاعر صاحب کی طرف دیکھا، پھر میری طرف۔ میں نے اپنی ہنسی چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

اب انھوں نے دوسرا شعر پڑھا:

تو اے رہرو ز راہِ خویشتن از یک قدم بر کن
زمینے را، زمانے را، مکینے را، مکانے را

اب صوفی صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انھوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں یہ سب تمھاری شرارت ہے۔

اسی عالم میں شاعر صاحب نے تیسرا شعر پڑھا۔

نظیری شاعرے یک تا ز خائے ہست پیشِ من
کہ من دانم سخن را، شعر گوئی را، بیانے را

اب صوفی صاحب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا "جگن ناتھ یہ سب تمھاری شرارت معلوم ہوتی ہے۔" ادھر اس شعر پر تمام طلبہ نے قہقہہ لگایا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ چوتھا شعر فحش تھا۔ شاعر صاحب نے وہ بھی پڑھ دیا۔ صوفی صاحب کو غصہ آ گیا اور مجھ سے کچھ پوچھے بغیر مجھے حکم دیا:

"AZAD, GET OUT OF THE CLASS-ROOM"

اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے دو ایک بار "Sir, Sir" کہہ کے بات کرنا چاہی۔ اب یاد نہیں میں اس بات سے انکار کرنا چاہتا تھا اور کہنا چاہتا تھا کہ یہ لغو غزل میں نے کہہ کے نہیں دی یا معافی مانگ لینا چاہتا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا لیکن صوفی صاحب نے میری بات سنے بغیر اپنے حکم کو دہرایا اور میں کلاس روم سے باہر آ گیا۔

دوسرے دن صوفی صاحب نے مجھے بلایا۔ میں عالم ندامت میں ان کے پاس پہنچا۔ بیشتر اس کے کہ میں معذرت چاہتا انھوں نے کہا جگن ناتھ! کلاس روم کا ایک ضابطہ ہوتا ہے۔ تم نے فحش شعر لکھ کے اس احمق کو دے دیا اور اس نے وہ کلاس روم میں پڑھ بھی دیا۔ اسے تو معلوم نہیں کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے لیکن تمھیں تو معلوم ہے کہ کلاس میں طالبات بھی ہیں۔ اب مجھے یہ جرأت نہ ہوئی کہ جھوٹ بولوں اور کہوں کہ یہ غزل میں نے کہہ کے نہیں دی تھی۔ میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

صوفی صاحب نے کہا۔ مجھے خود اس بات پر افسوس ہے کہ میں نے تمھیں کلاس سے باہر جانے کو کہا لیکن بصورت دیگر اس کا طلبہ اور طالبات پر خراب اثر پڑتا اور وہ سمجھتے کہ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ ترجیحی سلوک کرتا ہوں۔ یہ بات تو سب بھانپ گئے تھے کہ یہ غزل تھی نے اسے کہہ کے دی ہے۔

میں نے اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی صوفی صاحب کو غصے کی حالت میں نہیں دیکھا

ایم۔ اے کی تعلیم کی مدت بہت جلد ختم ہوگئی۔ مجھے دو برس کا کورس دفعتہ ایرا اور سکستھ ایر ایک برس میں مکمل کرنے کی بطور خاص اجازت ملی تھی اور ایک برس کے معنی عملی طور پر چھ سات ماہ ہی ہوتے ہیں ؎

زشیشہ تابہ قدح ریختم بہار گزشت

ایم۔ اے کے بعد میں ملازمت کے چکر میں پھنس گیا اور صوفی صاحب سے ہر روز کا ملنا جلنا ختم ہوگیا

ہندوستان کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں ہند پاک مشاعروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، جو ۶۵ء تک رہا۔ اس دوران میں مجھے پاکستان اور بالخصوص لاہور جانے کے کئی مواقع ملے۔ ان موقعوں پر صوفی صاحب کے ساتھ اکثر ملاقاتیں رہیں۔ ایک بار انھوں نے اپنے اس ہیچ مدان شاگرد کے اعزاز میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ اس میں مجھے پہلی بار احمد راہی کا پنجابی کلام جی بھر کے سننے کا موقع ملا۔

صوفی صاحب ہندوستان کے انڈو پاک مشاعروں میں شرکت کے لیے غالباً دو یا تین بار دہلی آئے۔ یہ مشاعرے اس زمانے میں صرف چیمسفورڈ کلب میں منعقد ہوتے تھے ان کا کلام اہلِ ہند نے ہمیشہ عزت اور احترام سے سنا۔

صوفی صاحب سے میری آخری ملاقاتیں گزشتہ دسمبر میں ہوئیں جب میں اقبال عالمی کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے یکم دسمبر سے ۱۲ دسمبر تک پاکستان میں رہا۔ ان گیارہ بارہ دنوں میں صوفی صاحب سے ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ دن میں کئی کئی بار۔ وہ بھی کانگریس کے مندوب تھے اور میں بھی اور کانگریس کے دن میں کئی سیشن ہوتے تھے۔ گویا صبح سے رات تک ساتھ ہی رہتا تھا۔

جس روز پنجاب کے گورنر جناب اسلم ریاض حسین نے لاہور کے عجائب گھر میں اقبال پر مصوری کی نمائش کا افتتاح کیا اس روز صوفی صاحب نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی

لیکن میں ایک جگہ پہلے سے مدعو تھا۔ ان کی دعوت قبول نہ کر سکا۔ اب خیال آرہا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی صوفی صاحب کے ساتھ کچھ وقت اور بسر ہو جاتا تو بہتر تھا۔

میں اس نمائش میں قدرے تاخیر سے پہنچا تھا۔ صوفی صاحب مجھے نمائش گاہ میں ڈھونڈ رہے تھے پھر رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے اکثر احباب نے بتایا کہ صوفی صاحب آپ کی تلاش میں ہیں۔ چنانچہ ہجوم میں میں نے انھیں ڈھونڈ نکالا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

اے جگن ناتھ تو کہاں ہے

آملا ہاتھ تو کہاں ہے

میں نے یہ شعر وہیں کاغذ پر لکھ لیا۔

اس سفر میں طویل ملاقات ان کے ساتھ اس دعوت میں ہوئی جو پاکستان کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق نے ہم مندوبین کو دی۔ ایک سو بہتر مندوبین کے علاوہ پاکستان کے متعدد عمائدین اور عمالِ حکومت اس دعوت میں شریک تھے۔ ہجوم خاصا تھا اور "کسے دابا کسے کارے نباشد" والا معاملہ تھا۔ آل احمد سرور، ڈاکٹر معز الدین، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور میں —— ہم چاروں ہجوم سے ایک طرف الگ اپنی محفل جمائے بیٹھے تھے اور صوفی صاحب اپنی داستانِ حیات کے گراں مایہ اوراق ایک ایک کر کے سامنے رکھتے چلے جا رہے تھے۔ اسی ملاقات میں پطرس بخاری کا ذکر آگیا اور یہ بات پہلی بار صوفی صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوئی کہ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں ارونا آصف علی جب کچھ مدت کے لیے روپوش رہیں تو وہ دراصل احمد شاہ پطرس بخاری کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کے گھر ہی میں روپوش تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بخاری صاحب کے زیرِ حکم ہر روز پانچ سات بار آل انڈیا ریڈیو دہلی سے یہ اعلان ہوتا تھا کہ ارونا آصف علی کے متعلق اطلاع دینے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔

اسی ملاقات کے دوران میں انھوں نے اپنی تصنیف "سراپردۂ افلاک" کا ذکر کیا۔ یہ کتاب "جاوید نامہ" کے بعض حصوں کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ دراصل انھی دنوں میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے چھاپی تھی اور ابھی تک بازار میں نہیں آئی تھی۔ سرور صاحب نے اور میں نے کہا کہ یہ کتاب ہم نے نہیں دیکھی۔ انھوں نے اس کتاب کا تھوڑا بہت ذکر کیا اور مجھ سے بطورِ خاص کہا کہ تم چونکہ "جاوید نامہ" کا اول سے آخر تک نثر میں ترجمہ کر رہے ہو اس لیے اس کتاب

کو ایک نظر دیکھ لو۔ اس کے بعد اگلے روز صوفی صاحب نے اس کتاب کی ایک جلد مجھے عنایت کی جو ان کی یادوں اور اس علم کی دولت کی طرح جو انھوں نے مجھے عطا کی ان کی ایک لازوال یادگار کی طرح میرے پاس ہے۔

اس وقت جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، یہ کتاب میرے سامنے رکھی ہے اور یہ ان اشعار پر ختم ہو رہی ہے:

یہ مشکِ ناب تیرے خونِ دل کا ایک قطرہ ہے
پھر آہوئے حرم دشتِ خطا کی جستجو کیسی
جہانگیری و سلطانی سے شوکت ہے فقیری کی
سر پر حم طلب کر بوریا کی جستجو کیسی
جہاں بینی کرامت ہے ہماری، ہم قلندر ہیں
نگہ ہم سے طلب کر کیمیا کی جستجو کیسی

شاید صوفی صاحب مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوتے وقت مجھے درسِ زندگی دے کے جا رہے ہیں اور استاد اور شاگرد کے اس رشتے کی تکمیل کر رہے ہیں جو آج سے چالیس برس قبل شروع ہوا تھا۔

اقبال عالمی کانگریس کا آخری اجلاس سیالکوٹ میں منعقد ہوا۔ صوفی صاحب سے یہاں بھی ملاقات ہوئی۔ اس آخری روز اقبال عالمی کانگریس کا ایک پروگرام یہ تھا کہ تمام مندوبین اور دوسرے اہلِ علم حضرات پر مشتمل ایک جلوس سیالکوٹ کے قلعے سے چل کے علامہ اقبال کے جدی مکان پر پہنچے اور وہاں شاعرِ مشرق کی یاد میں اپنے عقیدت کے پھول نچھاور کرے۔ منتظمین نے اس جلوس کی رہنمائی کا قرعہ اس ہیچ مدان کے نام نکالا اور میرے پاس آکر ان الفاظ میں یہ تجویز میرے سامنے رکھی کہ "آزاد صاحب! اس جلوس کی رہنمائی کا حق صرف آپ کو پہنچتا ہے۔" میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا لیکن میں نے عرض کیا کہ یہ بات نامناسب ہے، کیونکہ اس جلوس میں میرے دو اساتذہ محترم بھی شریک ہیں۔ ایک صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور دوسرے ڈاکٹر سید عبداللہ۔ یہ بات مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ میں جلوس کی رہنمائی کروں اور میرے اساتذہ میرے پیچھے چلیں۔ منتظمین میں سے ایک نے کہا کہ "آزاد صاحب! اگر آپ ایسے ہی سعادت مند شاگرد ہیں تو ہم آپ کو آپ کے اساتذہ سے حکم دلواتے ہیں کہ آپ اس جلوس

کی رہنمائی کریں۔" چنانچہ وہ صوفی صاحب اور سید محمد عبداللہ کے پاس گئے۔ صوفی صاحب نے مجھ سے کہا کہ جگن ناتھ! اس سے بڑھ کے ہم لوگوں کے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہمارا ایک شاگرد دنیا کے انتیس ملکوں سے آئے ہوئے مندوبین کے جلوس کی قیادت کر رہا ہے۔ یہ بات ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔ اٹھو اور جلوس کی رہنمائی کرو۔" چنانچہ میں نے تعمیلِ ارشاد کی۔

رات کو سیالکوٹ میں انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ اس کی صدارت کا اعزاز بھی اہلِ پاکستان نے مجھ خاکسار کو ہی دیا۔ میں اپنی بے علمی کی بنا پر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور اہلِ پاکستان تھے کہ محبت کے خزانے مجھ ہیچ مداں پر لٹا رہے تھے۔ اس مشاعرے میں صوفی صاحب بھی شریک تھے۔ یوں توفیق بھی تھے، احمد ندیم قاسمی بھی، سردار جعفری بھی، جمیل الدین عالی بھی، منیر نیازی بھی، احمد فراز بھی، اور اردو کے بعض اور نامور شعرا بھی، لیکن جب میری صدارت کا اعلان ہوا تو میں صوفی صاحب کے پاس گیا۔ اور ان سے میں نے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں آپ کی صدارت کا اعلان کر دوں۔ میں آپ کی صدارت میں اپنا کلام پڑھوں تو مناسب بات ہے۔ آپ میری صدارت میں کلام پڑھیں تو بات کچھ بنتی نہیں۔ مجھے موجودہ فیصلے سے اُلجھن ہو رہی ہے۔ صوفی صاحب نے میری بات سنتے ہی مجھے ڈانٹ دیا اور کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آئیں بائیں شائیں نہ کرو۔ جاؤ اور کرسیِ صدارت سنبھالو۔ مجھے ان کا چالیس برس پہلے والا لہجہ یاد آگیا جب انھوں نے کلاس روم میں مجھ سے کہا تھا:

"AZAD, GET OUT OF THE CLASS-ROOM."

ان ملاقاتوں کے دوران میں کہنہ سالی کے باوجود صوفی صاحب کی صحت مجھے اچھی نظر آئی۔ گمان ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان واپس آنے کے دو ہی مہینے بعد ان کے انتقال کی خبر سننے میں آئے گی۔ لیکن موت تو ایک خدائی راز ہے۔ صحت اچھی ہے یا نہیں ہے، یہ تو فروعی باتیں ہیں۔ بنیادی اور حقیقی بات تو یہ ہے کہ موت برحق ہے اور جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن ضرور اس دنیا سے رخصت ہونا ہے لیکن بقول اقبالؔ:

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

اور صوفی غلام مصطفٰے کی زندگی جو ہر لمحہ علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہی اس شعر کی تفسیر تھی۔

۹ فروری ۱۹۷۸ء

مولوی عبد الحق

۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخل ہونے کے لیے لاہور آیا تو یہاں کی فضا نے کالج کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے آوارہ گردی کے رستے پر ڈال دیا۔ چنانچہ کچھ مدت لاہور میں بے مقصد رہنے کے بعد میں پھر واپس راولپنڈی جا پہنچا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ پہلے یہ سلسلہ ایک پرائیوٹ کارپوریشن کے طور پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہال میں شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد سرکاری ادارہ بن گیا۔ سید احمد شاہ بخاری اس کے کنٹرولر تھے جو بعد میں ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ میں نے ملازمت کے لیے ان کے نام اپنی درخواست بھیج دی۔ بخاری صاحب نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا۔ والد نے مجھے مولوی عبدالحق کے نام ایک خط دیا کیونکہ اس وقت دہلی میرے لیے ایک نیا شہر تھا، اور دہلی آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔

اس زمانے میں انجمن ترقیِ اردو (ہند) اپنے پورے شباب پر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی (دریا گنج) میں اس کا دفتر تھا۔ اسی میں مولوی صاحب کا قیام تھا۔ علامہ برج موہن کیفی مرحوم بھی وہیں فروکش تھے۔ میں خط لے کر حاضر ہوا تو بڑی محبت سے ملے اور فرمانے لگے۔ تمہارا قیام یہیں میرے یہاں ہوگا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے جاکر کہنے لگے۔ یہ بڑا تاریخی کمرہ ہے۔ اس میں کانگریس کمیٹی کے دنوں میں جواہر لال نہرو ٹھہرے تھے۔ تم اسی میں جب تک چاہو قیام کرو۔ پھر اس کوٹھی کے دوسرے کمروں کا ذکر کر کے بتانے

لگے کہ فلاں کمرے میں مولانا محمد علی مرحوم، فلاں میں پنڈت موتی لال نہرو اور فلاں میں مہاتما گاندھی فروکش تھے۔ مجھے اس سے پہلے اتنے بڑے مکان اور بالخصوص اتنی تاریخی حیثیت کے مکان میں قیام کرنے کا کہاں موقع ملا تھا۔ دیر تک ایک حیرت آمیز مسرت کی کیفیت رہی سب سے زیادہ مسرت کا سبب تو مولوی صاحب کی وہ شفقت تھی جس کا مجھے پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

باتوں کے دوران میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ تمھارا انٹرویو کب ہے۔ میرے یہ بتانے پر کہ جناب انٹرویو کی تاریخ تو گزر چکی ہے، بہت ہنسے اور بولے کہ پھر تم آئے ہی کیوں ہو۔ میں نے کہا بخاری صاحب سے جا کر کہہ دوں گا دفتر کی چٹھی راولپنڈی میں ملی، میں لاہور میں تھا، دوبارہ راولپنڈی جانا پڑا اور اب وہاں سے دہلی آ رہا ہوں۔ کہنے لگے۔ تم ابھی کالج کے ماحول سے باہر آئے ہو، تمھیں دنیا کا تجربہ نہیں۔ ان باتوں کو کوئی نہیں سنتا تمھیں تو دفتر کے لوگ بخاری صاحب تک پہنچنے ہی نہ دیں گے۔ وہ یہی کہہ دیں گے کہ انٹرویو کی تاریخ گزر چکی ہے، تمھیں واپس روانہ کر دیں گے لیکن چلو اس بہانے دہلی کی سیر تو ہو جائے گی۔ انجمن کا کتب خانہ بھی اطمینان سے دیکھتے رہو۔ اس کمرے میں تاریخی کتابیں ہیں، اس میں تنقیدی کتابیں، فلاں کمرے میں نادر کتابوں کا ذخیرہ ہے اور فلاں میں قلمی مسودے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رات کو کھانے پر پانچ سات حضرات موجود تھے۔ علامہ کیفی اور رحم علی الہاشمی صاحب کے علاوہ اور جو حضرات تھے ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ میں کھانے کی میز پر اور ویسے بھی اس ماحول میں دبکا دبکا سا رہتا تھا۔ اٹھارہ انیس برس میری عمر تھی۔ ان علمی شخصیتوں سے بات کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔ اس وقت تک اگرچہ "ادبی دنیا" لاہور اور "زمانہ" کانپور میں میری دو چار غزلیں چھپ چکی تھیں لیکن ان دو چار غزلوں کے سہارے مولوی عبدالحق اور علامہ کیفی مرحوم ایسے علما کے سامنے لب کشائی کی جرأت تھوڑا ہی ہو سکتی تھی۔ اور اس وقت کا کیا سوال، آج بھی میرے لیے یہ کہاں ممکن ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے روبرو حوصلے سے بات کر سکوں۔

تو خیر دوسرے دن میں انٹرویو کے لیے براڈکاسٹنگ ہاؤس جا پہنچا۔ اس زمانے میں ریڈیو کے تمام دفاتر ایک ہی جگہ نہ تھے بلکہ شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کنٹرولر آف براڈکاسٹنگ کا دفتر اسکندرا روڈ پر تھا۔ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن انڈر ہل روڈ پر۔ مجھے چونکہ کنٹرولر کے دفتر سے بلاوا تھا اس لیے اسکندرا روڈ پہنچا۔ مولوی صاحب کی بات حرف بحرف

صحیح نکلی۔ وہاں صورت حال یہ تھی کہ ؎

سگ و دربان چو یافتند غریب
ایں گریباں گرفت و آں دامن

جس کمرے میں گیا یہی جواب ملا کہ بخاری صاحب سے ملاقات ممکن نہیں۔ انٹرویو تو پرسوں تھا آپ آج آرہے ہیں۔ جن امیدواروں کا انٹرویو ہونا تھا ہو چکا۔ بورڈ کے اراکین اپنے اپنے شہر کو واپس جا چکے۔ اب انٹرویو کا کیا سوال۔ ن۔ م راشد اور کرشن چندر انڈریل روڈ والی بلڈنگ میں تھے، ورنہ ان سے کچھ مدد حاصل کرتا۔ آخر بخاری صاحب کے سکریٹری سے میں نے کہا کہ میرا کارڈ اندر بھیج دیں۔ بخاری صاحب نہ ملنا چاہیں گے تو نہ بلیں گے۔ کارڈ اندر بھیجنے میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔ میں نے کارڈ پر اپنے نام کے ساتھ والد کا نام بھی لکھ دیا تھا اور یقین تھا کہ "انٹرویو" ہو نہ ہو "ملاقات" تو ہو ہی جائے گی۔

کارڈ اندر گیا تو دو چار منٹ ہی میں بخاری صاحب نے بلا لیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو اخلاق اور تہذیب کے ایک دل نشیں پیکر کو اپنے سامنے دیکھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے بخاری صاحب کو پہلی بار نیکر پہنے دیکھا۔ اردو ادب کا یہ عدیم المثال مزاح نگار، پطرس کے مضامین کا مصنف، مجھے اس وقت متانت اور سنجیدگی کی ایک تصویر نظر آرہا تھا۔ انھوں نے بات تو یہی کہی کہ انٹرویو کی تاریخ گزر چکی ہے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے براڈکاسٹنگ ہاؤس کی حدود میں داخل ہو کر کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ غالباً دل نوازی کا سلیقہ ان کے لہو میں کارفرما تھا۔

خیر واپس آکر مولوی عبدالحق صاحب کو ساری داستان کہہ سنائی۔ بہت محظوظ ہوتے، کہنے لگے مجھے اس بات کا یقین تھا کہ تاریخ مقررہ کے بعد انٹرویو ممکن نہیں لیکن میں نے تمھیں اس لیے نہیں روکا کہ اس قسم کا تجربہ زندگی میں ضروری ہے۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تمھاری ملازمت کے بارے میں اب میں کچھ سوچوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن انھوں نے خود مجھ سے اس موضوع پر بات کی۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر[1] کا دفتر یونی ورسٹی انکلیو میں ہے

---

[1] ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر مرزا ہرگوپال تفتہ کے خاندان سے تھے۔ شاعر بھی تھے اور شاعروں کے قدرداں بھی۔ ایک مدت تک آپ لاہور میں رہے، پھر دہلی آگئے۔ یہاں وہ بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں منسٹری آف ایجوکیشن کے سکریٹری بنے۔ ریٹائر ہونے سے قبل ہی آپ کا انتقال ہو گیا "لاجونتی"، آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر نظمیں ان کی رفیقۂ حیات لاجونتی کے انتقال پر ہیں۔

تم ان سے جاکر ملو۔ میں تمھیں خط دے دیتا لیکن تم اپنے والد کا نام بتا دینا، میرے خط کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس ہدایت کے مطابق میں اگلی صبح ڈاکٹر بھٹناگر کے وہاں جا پہنچا۔ ڈاکٹر بھٹناگر میرے والد کے مداحوں میں سے تھے۔ لاہور میں ایک دو بار ان سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ یہ اپنے دفتر میں بجلی کی سرعت سے کام کر رہے تھے۔ چند لمحوں میں انھوں نے نہ جانے کتنی فائلیں نکال ڈالیں۔ کتنے ہی لوگوں کے ٹیلی فون سنے اور کتنے ہی لوگوں کو ٹیلی فون کر ڈالا۔ میری جانب متوجہ ہوئے۔ میں نے کہا کہ مولوی عبدالحق صاحب کی ہدایت کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے میری مختصر سی بات بڑی توجہ سے سنی اور کہنے لگے ڈاکٹر عبدالحق کی بات تو میں کسی طرح نہیں ٹال سکتا۔ تم اس مضمون کی ایک درخواست مجھے دے دو۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور سیکریٹریٹ میں ملازمت آسانی سے مل جاتی تھی۔ میں اگلے دن درخواست لے کر حاضر ہوا۔ انھوں نے درخواست پر کچھ لکھا اور اپنے کسی ماتحت کو بلا کر اس کے سپرد کر دی۔

مجھے یقین تھا کہ ملازمت مل جائے گی۔ مولوی صاحب کو بھی امید تھی کہ ڈاکٹر بھٹناگر ان کی بات کا یقیناً خیال کریں گے لیکن تیسرے دن ہی یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھٹناگر بہ کار سرکار یورپ تشریف لے گئے ہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے بھئی اب تمھارا کام کچھ مشکل ہو گیا ہے۔ یہ دفتری نظام ہی ایسا ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے جانے کے بعد تمھاری درخواست کو کوئی اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا اور وہ جس فائل میں ہے اس میں دفن ہو جائے گی۔

اس کے بعد میں کوئی دو چار روز دہلی میں رہا اور روزانہ میں نے یہ دیکھا کہ ہر مکتب فکر کے لوگ مولوی صاحب سے ملنے آتے تھے۔ ان میں سیاسی جماعتوں کے لوگ بھی ہوتے تھے۔ مولوی صاحب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے۔ اور وہ تھا ہندوستان میں اردو کی ترقی کا مسئلہ۔ میں نے انھیں کبھی سیاسی جماعت کی حمایت یا مخالفت کرتے نہیں دیکھا۔ ان سے ملنے والوں میں کانگریسی، مسلم لیگی، کمیونسٹ اور مہاسبھائی ہر انداز فکر کے لوگ شامل ہوتے تھے لیکن مولوی صاحب کبھی سیاسی بحث میں نہیں الجھتے تھے۔ ویسے بھی انھیں کسی سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ حتی الامکان سیاست سے دور ہی رہتے تھے۔ انھی دنوں کا ذکر ہے مرحوم جناح صاحب دلی آرہے تھے۔ انجمن کے بعض لوگ کسی اور مہمان کو پہنچانے اسٹیشن جانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ تم لوگ اسٹیشن پر نہ جاؤ تو اچھا ہے، بعض لوگوں کو یہ گمان گزرے گا کہ انجمن ترقی اردو کے اراکین جناح صاحب کا استقبال کرنے آئے ہیں۔

اس قیام دہلی کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع لاہور میں ملا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ مولوی عبدالقادر قصوری کے دولت کدے پر ان کا قیام تھا۔ میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے وہاں حاضر ہوا۔ آپ انجمن ترقیٔ اردو کی صوبائی شاخ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں پہنچا تو بہت مصروف تھے۔ اندر بلا تو لیا لیکن زیادہ وقت نہ دے سکے فرمانے لگے شام کو میاں بشیر احمد کی کوٹھی پر آجانا، وہاں ایک بہت اہم جلسہ منعقد ہوگا اسی جلسے میں انجمن کی صوبائی شاخ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا تھا۔

تین برس بعد آپ پھر لاہور تشریف لائے۔ غالباً قیام ان کا ایک ہی دن رہا۔ مجھے ان کی آمد کا علم نہ تھا۔ شام کو استادِ محترم مولانا تاجور نجیب آبادی کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہم لاہور کے شعرا اس میں شریک تھے۔ تھوڑی دیر میں منتظمین مشاعرہ کے ہمراہ مولوی عبدالحق صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے مشاعرے کے اختتام پر اردو کے متعلق ایک ایسی پُر مغز تقریر کی کہ اہلِ لاہور نے شاید ہی ایسی تقریر کبھی سنی ہو۔

پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ اب میں ہندوستانی تھا اور قبلہ ڈاکٹر صاحب پاکستانی۔ ایک ہی خاندان کے افراد دو قوموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کی گولڈن جوبلی کی تقریب تھی۔ ہندوستان سے ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جگر مرادآبادی، جناب جوشؔ ملسیانی، جناب روشؔ صدیقی اور راقم التحریر کو شرکت کی دعوت ملی۔ میرا پاکستان کا یہ سفر ایک عجیب کیف و نشاط سے لبریز تھا۔ کراچی میں انجمن کی جوبلی کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں مشاعرہ تھا اور پھر واپسی پر پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ گارڈن کالج راولپنڈ اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور تو وہی درس گاہیں ہیں، جہاں میں نے بات کرنے کا طریقہ سیکھا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے ملاقات کی مسرت اور گارڈن کالج اور پنجاب یونی ورسٹی کی زیارت کا شوق ایک طرح سے شوقِ پر پرواز بن گیا اور میں براہِ راست کراچی جا پہنچا۔

اب کے میرا قیام پھر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ عمارت بھی جس میں انجمن کا دفتر ہے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے باتوں باتوں میں یہ راز افشا کیا کہ انجمن کی یہ عمارت بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا دہلی میں تو آپ نے مجھے جواہر لال نہرو کے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ اب میرا قیام کس کمرے میں ہے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ میں کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ پہلی منزل پر

بائیں ہاتھ کا کمرہ ہے۔ فرمانے لگے اس عمارت کا اصل نام گاندھی آشرم ہے اور جس کمرے میں تم فروکش ہو اسی میں بیٹھ کر مہاتما گاندھی پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس پرارتھنا میں شریک ہوتے تھے۔ مختلف کمروں میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے ان کی آواز پہنچتی تھی اور وہ قرآن کی آیات اور وید کے منتر اسی کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

کراچی میں اب کے میرا قیام کئی روز کا تھا۔ راولپنڈی کے مشاعرے میں ابھی کوئی دس گیارہ روز باقی تھے اور دہلی واپس آکر راولپنڈی جانا آسان نہ تھا۔ راولپنڈی کے بعد لاہور میں بھی مجھے رکنا تھا۔ اس لیے ایسے پروگرام کا ارادہ ترک کر دیا، جو بھاگم بھاگ پر مشتمل ہو، چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جوش ملسیانی اور روش صاحب کی واپسی کے بعد میں ہندوستان والوں میں تنہا کراچی میں رہ گیا۔

اب کے مولوی صاحب کو اور زیادہ مدت کے لیے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی پابندیِ اوقات، ان کی مسلسل محنت، ان کا علی الصباح بیدار ہو کر سمندر کی سیر کو جانا، ان کی کم خوری یہ تمام باتیں میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھیں۔ کھانا تو وہ ایک زمانے سے ایک ہی وقت کھاتے ہیں۔ رات کو۔ دن کو وہ کھانا نہیں کھاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ دن کا کھانا طبیعت میں گرانی پیدا کرتا ہے اور یہ گرانی روزانہ کے کام میں حارج ہوتی ہے۔ رات کا کھانا بھی وہ اتنا کم کھاتے ہیں کہ خوردن برائے زیستن کا اس پر پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ میرے لیے تو اتنی کم خوری حیرت کا باعث تھی۔ ایک دو بار میں نے ارادہ کیا کہ صبح ان کے ساتھ ہوا خوری کے لیے جاؤں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ صبح ۴ بجے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر سیر کے لیے گھر سے چل دیتے ہیں تو مجھے اپنا ارادہ فسخ کرنے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جو کام بلکہ سیر و تفریح اسّی برس کی عمر میں وہ بآسانی کر لیتے تھے وہ میرے لیے چونتیس برس کی عمر میں ممکن نہ تھی۔ میری روانگی کے روز جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بر بنائے کاہلی اپنا ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہا ہوں تو انھوں نے صبح کی سیر اور مناظر سے لطف اندوزی کی لذت کو کچھ اس سحر آفریں انداز سے بیان کیا کہ دہلی واپس آکر میں نے سچ مچ صبح کی سیر شروع کر دی اور کئی ماہ تک اسے جاری رکھا۔

اسی سفر کا ذکر ہے ایک دن شام کو میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا ذکر چل نکلا۔ اردو کی بقا اور ترقی کے متعلق ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کی روش صاحب نے بڑی واضح اور عمدہ تصویر پیش کی۔ آپ ساری

روداد بہ غور سنتے رہے۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ بعد میں کہنے لگے ہاں لیکن یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میں بالکل غیر مطمئن ہوں چنانچہ غالباً یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنے خلافِ مزاج اردو کے سلسلے میں ایک ایجی ٹیشن چلانا پڑی اور سیکریٹریٹ تک ایک جلوس کی رہنمائی کرنا پڑی۔

اس مختصر سے قیام میں مجھے اس کمرے میں بھی حاضری کے مواقع ملے جس میں مولوی صاحب دن بھر گرمی، سردی، برسات سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ کمرہ سادگی اور نفاست پسندی کی ایک دل کش تصویر تھا خطوط، کتابیں، فائلیں، مسودے، ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے موجود اور مولوی صاحب اس انہماک سے لکھنے یا پڑھنے میں مشغول ہیں کہ انھیں کسی کی آمد کا احساس تک نہیں ہے دو ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں کمرے میں ایک آدھ منٹ توقف کے بعد انھی قدموں واپس لوٹ آیا کیوں کہ کام میں ان کی یک سوئی نے مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ پیدا ہونے دی کہ میں ان کے انہماک میں مخل ہو سکوں۔

یہ میں آج سے سات برس پہلے کی بات بتا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد کئی بار ڈھاکہ، چٹاگانگ اور لاہور جانے کا اتفاق ہوا لیکن میں کراچی نہ جا سکا۔ ایک بار گیا تو یوں کہ مشاعرے میں شرکت کے بعد علی الصباح وہاں سے روانہ ہوا۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں اس دس دن کے قیام کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع نہ مل سکا۔ اور اب موجودہ حالات کے پیشِ نظر کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب یہ سعادت نصیب ہو۔

ع کشتی شکستہ گانیم اے بادِ شرطہ برخیز

نئی دہلی

۲۴؍دسمبر ۱۹۶۰ء

شیخ سر عبدالقادر

بالعموم کسی عزیز کی موت کی خبر سن کر شدید صدمہ ہوتا ہے اور سر عبدالقادر کی ذاتِ گرامی سے میرا قرب اس امر کا متقاضی تھا کہ ان کے انتقال کی خبر سے مجھے شدید صدمہ ہوتا لیکن آج جب میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تو میرے دل کی وہ کیفیت نہیں ہوئی جو ایسے موقعوں پر بالعموم ہوتی ہے۔

میں ایک دوست کے ساتھ اردو بازار کے ایک ریستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اچانک ایک خبر پر نگاہ پڑی ——— سر عبدالقادر انتقال فرما گئے ——— بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "ایک محترم باوقار زندگی آج اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی!" ساتھ بیٹھے دوست نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے اسے بتایا کہ "اردو کا ایک اور کارواں تمام زندگی اپنے فرض میں منہمک رہنے کے بعد آج ابدی نیند جا سویا ہے۔ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے! اس زندگی پر جس قدر رشک کیا جائے کم ہے۔"

سر عبدالقادر کو میں نے پہلی بار ۱۹۳۴ء میں دیکھا، جب آپ انجمن اسلام کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے راولپنڈی تشریف لائے تھے۔ میں اس وقت ڈی۔ اے۔ وی کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ انجمن اسلام کے اس جلسے میں شرکت کے لیے والدِ محترم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں بھی ان کے ہمراہ اجلاس میں شریک ہوا۔ یہ اجلاس اسلامیہ ہائی اسکول مری روڈ کے وسیع دالان میں منعقد ہو رہا تھا۔

جب ہم پہنچے تو ابوالاثر حفیظ جالندھری نظم پڑھ رہے تھے۔ مجھ پر ایک وجد کا عالم طاری تھا گویا کسی نے طلسم کر دیا ہو۔ والدِ محترم جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو حفیظ صاحب نے پڑھنا بند کر دیا اور "محترم صاحب!" کہہ کر والد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شیخ سر عبدالقادر اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک قدم آگے بڑھے۔ اتنے میں والد منتظمین کی معیت میں ڈائس تک پہنچ چکے تھے۔ شیخ صاحب ان سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ ہی ڈائس پر انھیں جگہ دی یہ شیخ سر عبدالقادر کی پہلی تصویر تھی جو میں نے دیکھی اور جس نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ آج بھی جب شیخ صاحب کا خیال آتا ہے تو وہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

دوسری ملاقات ۱۹۳۷ء میں ہوئی جب انجمن ترقیِ اردو راولپنڈی کے زیرِ اہتمام ہم لوگوں نے یومِ اقبال منایا۔ سر عبدالقادر سے ہم نے صدارت کی درخواست کی تھی۔ آپ تشریف لائے اور دو دن گارڈن کالج اور ڈی۔ اے۔ وی کالج میں اجلاس کی صدارت فرماتے رہے۔

راولپنڈی کا مذکورہ یومِ اقبال ہندوستان کے ان چار بڑے قابلِ ذکر اجلاسوں میں تھا جو علامہ مرحوم کی زندگی میں منعقد کیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا یومِ اقبال لاہور میں منایا گیا تھا اور یہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد راولپنڈی کا مذکورہ اجلاس جو عبدالعزیز فطرت کی شبانہ روز کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ تیسرا اجلاس لاہور کا تھا جو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے منعقد کیا تھا اور چوتھا حیدر آباد کا جس میں مسز سروجنی نائیڈو اور نواب بہادر یار جنگ نے شرکت کی تھی۔

راولپنڈی کے اجلاس میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں کئی پروگرام تھے۔ ایک حصہ یہ تھا کہ اکثر حضرات نے اقبال کے سات سات پسندیدہ اشعار سنائے۔ تمام حضرات نے اقبال کی کتابوں میں سے اشعار منتخب کیے لیکن سر عبدالقادر اور والدِ محترم نے بعض ایسے اشعار بھی سنائے جو اقبال کی اپنی مرتب کی ہوئی کتابوں میں موجود نہیں ہیں بلکہ بعد میں کہیں آکر وہ "باقیاتِ اقبال" اور اس طرح کی اقبال کے متروک کلام پر مشتمل دوسری کتابوں میں شامل ہوئے۔ شیخ سر عبدالقادر کے سنائے ہوئے ایسے اشعار میں ایک شعر یہ تھا:

شبِ فرقت تصور تھا مرا اعجاز نما کیا تھا
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

اور والدِ محترم کے سنائے ہوئے اشعار میں دو شعر یہ تھے :

مجھے اقبالؔ اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

اور

دلم سوخت، تنم سوخت، استخواں ہم سوخت
تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست

اس موقع پر شیخ صاحب نے اقبالؔ کے ساتھ اپنی دوستانہ زندگی کے متعدد واقعات سنائے جو اب بعض جرائد اور کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک عجیب و غریب بات جو اپنی تقریر میں شیخ صاحب نے کہی وہ یہ تھی کہ "بانگِ درا" کا دیباچہ جو میں نے اقبال کی فرمائش پر لکھا تھا اقبالؔ نے "بانگ درا" میں شامل کرنے سے قبل اپنے بعض دوستوں کو دکھایا ان میں سے اکثر نے دیباچہ پڑھ کے اقبال کو یہ رائے دی تھی کہ یہ دیباچہ "بانگ درا" میں شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ "بانگ درا" کے معیار کا نہیں ہے۔ لیکن اقبالؔ نے یہ دیباچہ "بانگِ درا" میں شامل کیا اور اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھوں نے اسے پسند کیا ہو گا۔ شیخ صاحب نے کہا کہ یہ بات خود اقبال نے مجھے بتائی تھی اگرچہ ان لوگوں میں سے کسی کا نام نہیں بتایا جنھوں نے دیباچے کے بارے میں مخالفانہ رائے دی تھی۔

اس کے دو سال بعد پھر والد صاحب کی ہمراہی میں لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے دولت کدے "دل کشا" میں۔ ۵ کیمپل روڈ پر۔ اس وقت آپ غالباً وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے اس ملاقات میں شیخ صاحب اور والد محترم اقبال اور اقبال کی شاعری کے متعلق ہی بات چیت کرتے رہے۔

اس ملاقات میں "مخزن" کے پہلے دورادوار کا بھی ذکر آیا اور غلام بھیک نیرنگ، ابوالنصر آہؔ، درگا سہائے سرورؔ، برج نارائن چکبستؔ، صادق از کشمیر اور خوشی محمد ناظرؔ کی باتیں بھی ہوتی رہیں جو دورِ "مخزن" کے اہم شعرا تھے۔

دورانِ گفتگو میں شیخ صاحب نے اپنے متعلق ایک بات کہی جس سے ان کے نظریہ اقدارِ زندگی پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیوی اعتبار سے خدا نے مجھے بہت عزتیں دی ہیں۔ میں وزیرِ ہند کی ایڈوائزری کونسل کی ممبری تک پہنچا ہوں لیکن جب

بھی دو چار احباب جمع ہو جاتے ہیں اور میرا ذکر ہوتا ہے تو اس کا تعلق نہ ایگزیکٹیو کونسل کی ممبری سے ہوتا ہے نہ ہائی کورٹ کی ججی سے بلکہ میری زندگی کے اس دور سے ہوتا ہے جب میں "مخزن" کو مرتب کیا کرتا تھا۔ میں خود بھی اس دور کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد لاہور میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات میں ان سے میں نے کہا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں حفیظ جالندھری کی کامیابی میں دو چیزوں کا ہاتھ ہے ایک ان کا ترنم اور دوسرا آپ کی مربیانہ روش۔ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ بولے تمہارا کیا خیال ہے۔ تم اپنی رائے ظاہر کرو۔ میں نے کہا میں تو اس بات کو صحیح نہیں سمجھتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے حفیظ صاحب کی شاعری میں خود اتنی جان ہے کہ وہ اپنے پروں سے اڑ سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوائے۔ کہنے لگے تمہاری رائے صحیح ہے۔ یہ جو تم نے لوگوں کی رائے کا ذکر کیا ہے یہ حفیظ صاحب کے حاسدوں اور مخالفوں کی رائے ہے۔ میں نے حفیظ کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ محض اتنا ہے کہ "شاہنامۂ اسلام" کا دیباچہ لکھا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ حفیظ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دے۔ دیباچے تو میں نے اور بھی شاعروں کے لکھے ہیں۔ اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا اس وقت نام بھی کوئی نہیں جانتا۔

کچھ دن بعد میں نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ "اقبال" مرتب کیا۔ اس میں تمام نظمیں اقبال ہی کے بارے میں تھیں بعض نظموں میں اقبال کے مصرعوں یا اشعار کی تضمین تھی۔ یہ مسودہ میں نے دیباچے کے لیے شیخ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے بڑی محبت سے اس کتاب کا دیباچہ لکھا اور بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں میری کوششوں کو سراہا۔

یہ مسودہ تو ۴۷ء کے فسادات میں تلف ہو گیا لیکن دیباچہ میرے پاس محفوظ رہا اور اس وقت یہ آپا حمیدہ سلطان احمد کی مرتب شدہ کتاب "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" میں شامل ہے۔

میں ۱۹۴۶ء میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر پنجاب کے ایک روزنامہ اردو اخبار "جے ہند" کے عملے میں شامل ہو گیا تھا۔ میرے ذمے اخبار کی نمائندگی کے فرائض تھے اور میں اخبار کے لیے مختلف موضوعات پر مختلف اشخاص سے انٹرویو لیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک دن میں قبلہ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ساتھ اخباری انداز کی

بات چیت چھیڑ دی۔ یہ انٹرویو اس وقت میرے سامنے ہے اور چونکہ اس انٹرویو سے شیخ صاحب کی زندگی کا ایک ایسا پہلو سامنے آتا ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں اس لیے میں اس انٹرویو کو اول سے آخر تک نیچے درج کر رہا ہوں:

"سیاسی موضوعات پر ملاقاتوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے نمائندہ "جے ہند" شیخ سر عبدالقادر کے پاس پہنچا اور درخواست کی کہ علم و ادب کے کسی ایسے پہلو پر روشنی ڈالیں جو آج تک منظر عام پر نہ آیا ہو۔ شیخ صاحب یہ سوال سن کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ پھر بولے اس سوال کے جواب پر مختصر طور پر کیا کہا جا سکتا ہے۔ ادب کے کئی ایسے مسائل ہیں جن پر ابھی تک کسی نے غور نہیں کیا۔ راقم نے کہا کہ مسائل پر بحث تو ایک مختلف چیز ہے مجھے کسی اور چیز کی تلاش ہے۔

"یعنی؟"

"مسٹر آصف علی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے پہلا مضمون آپ کے رسالہ "مخزن" میں شائع ہوا تھا تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کے ساتھ آپ کے مراسم بہت قدیمی ہیں۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ مولانا کے متعلق ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے کہا "مسٹر آصف علی کا کہنا صحیح ہے۔ مولانا آزاد کا پہلا مضمون واقعی "مخزن" میں شائع ہوا تھا اور وہ مضمون بھی ایک خاص ملاقات کا نتیجہ تھا جو کلکتہ میں ہوئی تھی۔"

راقم نے گزارش کی "تو پھر اس ملاقات ہی سے داستان کا آغاز فرمائیے۔" آپ نے کہا "ندوۃ العلماء" کلکتہ کی ایک علمی اور ادبی جماعت تھی۔ اس کی دعوت پر میں تقریر کرنے کے لیے ۱۹۰۱ء میں کلکتہ گیا۔ مولانا ابوالکلام جن کی عمر اس وقت سولہ یا سترہ برس کی ہو گی ان دنوں وہیں تھے وہ اپنے بھائی ابوالنصر آہ کے ہمراہ جلسے میں آئے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو میرے پاس آئے اور تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے "آپ نے خوب لیکچر دیا" تقریر میں ایک بچے کی اتنی دل چسپی دیکھ کر میں اس کی جانب متوجہ ہوا۔ اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مختصراً اتنی گفتگو ہی میں مجھے یہ علم ہو گیا کہ بچہ علم و ادب کی گود میں پرورش پا رہا ہے اور فلسفیانہ طبیعت رکھتا ہے۔ میں نے ان سے "مخزن" کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ اس کے لیے مضمون لکھیے۔ جب ملاقات ختم ہوئی اور آزاد صاحب تشریف لے گئے تو مولانا عبدالرحمٰن امرت سری جو میرے ساتھ تھے بگڑ کر

کہنے لگے۔ آپ بھی عجیب ہیں۔ ایک لڑکے سے باتیں کرنے بیٹھ گئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ لڑکے کی علمی
قابلیت اپنی عمر سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے میری بات کی جانب توجہ نہ دی۔
ہاں تو انھوں نے مضمون لکھا عنوان تھا NEWS - اور تشریح اس لفظ کی یوں کی
گئی تھی کہ اسے NEWS اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس میں S.W.B.N یعنی نارتھ، ایسٹ،
ویسٹ اور ساؤتھ ہر طرف کی اطلاعات موجود ہوتی ہیں۔ خیال نیا تھا۔ مجھے پسند آیا۔ مضمون
"مخزن" میں شائع ہو گیا۔

میر غلام بھیک نیرنگ اس زمانے میں "مخزن" کے ہر پرچے پر تنقید لکھ کر بھیجا کرتے
تھے۔ جب یہ مضمون ان کی نظر سے گزرا تو انھوں نے لکھا کہ مجھے یہ مضمون مبتدیانہ معلوم
ہوتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ "مخزن" کو طلبہ کا تختۂ مشق نہ بنایا جائے۔ "مخزن" میں فقط
معیاری مضامین شائع ہونے چاہئیں۔

میں نے جواب میں انھیں کلکتے کی ملاقات کا بالتفصیل ذکر لکھ کر بھیجا اور مضمون
کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی جو بالکل مختلف تھی لیکن وہ قائل نہ ہوئے۔

اس کے بعد مولانا نے امرتسر کے اخبار "وکیل" میں مضمون لکھنے شروع کیے۔ 'وکیل'
کے ایڈیٹر شیخ غلام محمد تھے۔ بعد میں "وطن" کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ اس کے مدیر مقرر
ہوئے۔ ان مضامین کے فوراً بعد مولانا پنجاب آئے اور پنجاب والوں کے ساتھ آپ کا رابطہ
پیدا ہوا۔ ابتدا میں آپ کو انگریزی سے واقفیت نہیں تھی لیکن بعد میں اپنی محنت سے اس
میں مہارت حاصل کر لی

مولانا آزاد علمی قابلیت تو گھر سے ہی لے کر چلے تھے۔ مگر شبلی مرحوم کی توجہ اور فیض صحبت
نے ان کی مذہبی تحقیق کے مادے کو ترقی دی اور طرز تحریر میں خوبی اور تاثیر پیدا کر دی۔

"مخزن" کے زمانے میں جب میں نے اردو سبھا کی تحریک جاری کی تو مولانا نے مجھے
چھٹی لکھی کہ میں اس تحریک کے ایک رضا کار کے طور پر کام کروں گا۔ ان کا یہی ادبی ذوق
تھا جو بعد میں "الہلال"۔ "البلاغ" اور "ترجمان القرآن" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کانپور
کے حادثہ نے آپ کی طبیعت کا رجحان نیشنلزم کی جانب کر دیا اور آپ انڈین نیشنل کانگریس میں
شامل ہو گئے۔

مولانا آزاد کے ساتھ اپنے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ مولانا کے ساتھ

میرے مراسم آج بھی قائم ہیں اور اگرچہ فاصلے کے اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ لیکن اس مسافت سے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میاں افتخار الدین پنجاب کانگریس کے صدر تھے تو مولانا آزاد لاہور میں ہمیشہ ان کے ہاں قیام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ میاں صاحب کی کانگریس سے علیحدگی سے ذرا قبل مولانا آزاد یہاں آئے تو حسب دستور ان کے یہاں ٹھہرے اور ان سے کہا کہ مجھے سب سے پہلے شیخ عبدالقادر کے ہاں لے چلیے۔ چنانچہ وہ ہمارے ہاں تشریف لائے اور بہت دیر باتیں ہوتی رہیں۔

جب آپ دورِ "مخزن" کا ذکر کر رہے تھے تو اتفاق سے ہندی اور اردو جھگڑے کا ذکر آ گیا۔ آپ نے کہا کہ یہ جھگڑا ہمارا نہیں بلکہ انگریز کا پیدا کیا ہوا ہے۔ سب سے پہلے یوپی کے گورنر میکڈانلڈ نے یوپی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے کے لیے اس جھگڑے کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں یہ معاملہ ہندوستان گیر مسئلے کی صورت اختیار کر گیا۔ اور آج ہماری بدقسمتی سے آزادی کی راہ میں دیگر رکاوٹوں کی طرح یہ بھی ایک بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔"

ہندی اور اردو کے جھگڑے کا ذکر آپ نے اس درد بھرے انداز سے کیا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور اطمینان بھی کہ شیخ سر عبدالقادر نے غیر ذمہ دار لیڈروں کی طرح اس جھگڑے کا الزام ہندوؤں یا مسلمانوں کے سر نہ تھوپا بلکہ ایک قابل طبیب کی طرح صحیح طور پر مرض کی تشخیص کی اور بتایا کہ اس سارے مرض کی جڑ غیر ملکی حکومت ہے۔

آپ نے اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کشیدگی کا ذکر بھی کیا اور جب انھوں نے ہندوستان کے پرامن ماضی کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا کہ ان کی تمام کیفیت چہرے پر سمٹ آئی ہے۔

آپ کی یہ دلی تمنا تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی محبت اور مروت کا دور واپس آجائے افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور ان کی زندگی ہی میں پنجاب کی سرزمین پر انسانی لہو کا ایک دریا بہہ نکلا۔ اسی پنجاب کی سرزمین پر جہاں آپ نے علم و ادب کی متعدد زندگی بخش ندیاں جاری کی تھیں۔

سروجنی نائیڈو

کوئی پانچ منٹ تک گورنمنٹ ہاؤس کے پیچیدہ راستوں اور دروازوں سے گزرنے کے بعد گائڈ ایک کمرے کے سامنے رکا اور کمرے کے اندر جانے کا اشارہ کر کے واپس لوٹ گیا۔

ہم ابھی دروازے ہی پر تھے کہ "آیئے جوش صاحب تشریف لایئے" کی آواز نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے صوفے پر شریمتی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ آپ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جوش صاحب کو نمسکار کیا۔ اٹھنے کی کوشش کی لیکن جوش صاحب نے "تشریف رکھئے" کہہ کر انھیں روک دیا۔ آپ بیٹھ گئیں اور ساتھ کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھیے"

تعارف کا رسمی سلسلہ دو ایک منٹ میں ختم ہو گیا۔ جوش صاحب نے مزاج پوچھا، کہنے لگیں بیمار ہوں۔ کوئی نصف منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولیں۔ "آپ جوش صاحب کے ساتھ کام کرتے ہیں"۔ "جی ہاں" میں نے کہا اور بساطِ عالم کا نیا شمارہ انھیں پیش کیا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں "یہ مجھے ملتا ہے باقاعدہ اور اس کے اکثر مضامین میں پڑھتی ہوں۔ ہاں یہ شمارہ نیا ہے میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ یہ کہہ کر انھوں نے پرچہ قریب ہی صوفے پر رکھ دیا اور جوش صاحب کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

میں زندگی میں پہلی بار ایک گورنر سے ملاقات کر رہا تھا۔ گورنروں کے متعلق سنا تو بہت کچھ تھا لیکن انھیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا اور جو کچھ سنا تھا اس سے

یہاں صورت مختلف تھی۔ کبھی میری نظروں کے سامنے وہ فوجی وردی میں ملبوس سکرٹری آجاتا جو دو ایک بار کمرے میں داخل ہوا اور جو ہر بار ایک سپاہیانہ سلیوٹ کر کے واپس گیا اور کبھی سروجنی نائیڈو کے یہ اشعار میرے ذہن میں آجاتے تھے :

"O I am tired of painted roofs and
soft and silken floors,
And long for the wind blown
canopies of crimson gulmohurs'
O I am tired of strife and song
and festivals and fame
And long to fly where cassiawoods
are breaking into flame

یہ ایک عجیب تضاد تھا جو میری سمجھ سے بالا تھا لیکن کمرے کے ماحول اور ان اشعار میں ایک مطابقت بھی تھی۔ وہ کمرہ اور اس کا ساز و سامان اتنا سادہ تھا کہ اس پر گورنمنٹ ہاؤس کے کمرے کا کسی طرح بھی گمان نہ ہوتا تھا۔ فرش پر کوئی دری یا قالین نہ تھا۔ دیواروں پر کوئی تصویر نہ تھی۔ جھاڑ فانوس کہیں نظر نہ آرہے تھے۔ کرسیاں سادہ، میز معمولی قسم کی۔ صوفہ بھی جس پر شریمتی نائیڈو بیٹھی تھیں ایسا جیسے عام گھروں میں ہوتا ہے۔ گویا ایسی چیز کمرے میں موجود نہ تھی جو "گورنری" کے لفظ کے ساتھ کسی قسم کی مطابقت رکھتی ہو۔ معلوم نہیں گورنمنٹ ہاؤس کا آرائشی ساز و سامان کانگریس کے برسر اقتدار آنے کی وجہ سے ہٹا لیا گیا تھا یا سروجنی نائیڈو نے اپنے کمرے سے اس قسم کی چیزیں اٹھوا دی تھیں۔ بہر طور وہ کمرہ Soft and painted roofs and silken floors سے بالکل عاری تھا۔

"کہئے آپ کا مزاج کیسا ہے۔ سرکاری دفتر کے ماحول کو پسند کرتے ہیں آپ؟" جوش صاحب نے موجودہ نظام پر ایک ہلکی سی چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"دفتر میں مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہو رہی۔ ایک تو رفیق اچھے ملے ہیں۔ دوسرے کام لکھنے پڑھنے کا ہے۔ لہٰذا میں یہاں غیر مطمئن نہیں۔ لیکن ہندوستان کا موجودہ نظام میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ خیال یہ تھا کہ آزادی کے بعد علم و ادب کا رتبہ ملک میں بہت

بلند ہوگا اور ادیب اور شاعر زیادہ عزت اور اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں گے لیکن خلاف توقع ایسا ہوا نہیں۔ ایک آزاد ملک میں ادیبوں اور شاعروں کو جو مراعات حاصل ہونا چاہئیں وہ ہندوستان میں ابھی حاصل نہیں ہوتیں"۔ آپ نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولیں "آزاد ہوتے ہی ملک ایسے جھمیلوں میں گرفتار ہو گیا ہے کہ بعض ایسے تعمیری کاموں کی جانب توجہ دینا مشکل ہو گیا ہے جنھیں اولیت ملنا چاہئے تھی۔ علم وادب کی نشر واشاعت اور اس کی سرپرستی بھی ایسے ہی تعمیری کاموں میں ہے، جن کی جانب حکومت توجہ دینا چاہتی ہے۔ لیکن سیاسی الجھنوں کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کے باوجود مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ حالات سدھرنے میں بہت دیر نہ لگے گی۔"

یہاں جوش صاحب نے ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے تو یہ کشتی ڈوبتی نظر آتی ہے۔

آپ بولیں۔ "نہیں آپ کا خیال غلط ہے۔ اردو کا مستقبل اس ملک میں بہت روشن ہے۔ ذرا فرصت ملے تو میں اس ذمہ داری کو ہاتھ میں لے لوں گی۔ مجھے اس معاملے میں پنڈت جی سے بھی بات چیت کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اردو کے تحفظ کے لیے ایک ادارہ قائم ہو جائے۔"

آپ تھوڑی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد تھک جاتی تھیں اور ایک آدھ منٹ کے توقف کے بعد پھر گفتگو شروع کرتی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے لیکن اس تھکاوٹ کے پردے میں بھی عظمت بدستور جھلک رہی تھی۔

اب کے توقف کے بعد آپ نے کہا "ساغر صاحب کہاں ہیں آج کل اور کیا حال ہے ان کا؟" جوش صاحب بولے "بمبئی میں ہیں اور حال ان کا وہی ہے جو دوسرے ادیبوں اور شاعروں کا ہے۔ وہ پھر "ایشیا" جاری کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں لیکن حکام بالا کی بے توجہی دیکھئے کہ وہ انھیں ٹیلیفون کا کنکشن تک نہیں دے رہے۔ اب جس ملک میں شاعروں کے ساتھ یہ سلوک ہو وہاں کوئی کیا زندگی بسر کرے۔ اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے وزرا سے کہا جائے تو معیوب نظر آتا ہے اور اگر نہ کہا جائے تو انھیں حقیقت حال معلوم نہیں ہوتی اور نچلے طبقے میں شاعر اور ادیب کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اب قدوائی صاحب سے میں نے کہا ہے انھوں نے جواب دیا ہے کہ ساغر صاحب کی ادبی خدمات کی

قدردانی لازمی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ انھیں ٹیلی فون مل جائے۔ اب معلوم نہیں ان کی کوشش بار آور ہوتی ہے یا نہیں۔

آپ نے کہا "نہیں میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ میں ساغر صاحب کے لیے کوئی اور مستقل صورت پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ لکھنؤ چل کر مجھے دو باتیں یاد دلائیے۔ ایک ساغر صاحب کا کام، دوسرا "آج کل" کے لیے نظم"۔ سکریٹری نے یہ ہدایت اپنی ڈائری میں نوٹ کر لی۔

اس کے بعد آپ نے میری طرف توجہ کی اور کہا کہ آپ کا کلام تو میں اردو رسائل میں دیکھتی رہی ہوں لیکن کوئی کتاب آپ کی غالباً ابھی تک نہیں چھپی۔ میں نے کہا جی ہاں کتاب تو نہیں، ہاں ایک کتابچہ حکومت کشمیر نے شائع کیا ہے جس میں تمام تر نظمیں جنگ کشمیر کے متعلق ہیں یہ کہہ کر میں نے "طبل و علم" کی ایک جلد انھیں پیش کی۔ آپ نے سرسری طور پر ورق گردانی کی۔ ایک صفحہ پر آکر رک گئیں اور یہ تین مصرعے

. . . .

. . . .

. . . .

جس طرف بھی دیکھیے ہے لالہ و گل کا ہجوم
لالہ و گل میں دمکتی ہے جبین کشمیر کی
مسکرا اے لیلیٰ محمل نشیں کشمیر کی

پڑھ کر محض ایک قدرے طویل "ہوں" کی۔ اس پر جوش صاحب بولے آزاد ہمارے بہت اچھا کہنے والوں میں ہیں۔ آپ کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ اچانک ان کا ملٹری سکریٹری (یا پرائیویٹ سکریٹری۔ بہر طور وہ تھا فوجی لباس میں) اندر داخل ہوا اور بولا

There is a trunk call from
the Lucknow University. They are reminding you of
your participation in the function on the due date.

آپ نے فوراً ہی کہا:

No I am not coming. Ask them not to waste money
on trunk calls like that.

سکریٹری باہر چلا گیا اور آپ نے دروازے پر نظریں جمائے ہوئے کہا

Why do these people waste money on trunk calls.

اس کے بعد جوش صاحب نے پھر ساغر صاحب کا ذکر کیا اور آپ بولیں مجھے یاد رہے گا آپ مطمئن رہیں۔ اور بات چیت کا رخ بدل گیا۔ جوش صاحب نے پوچھا دہلی میں قیام کب تک رہے گا بولیں کل صبح واپس جا رہی ہوں

"ہوا سے؟"

"جی نہیں۔ ریل گاڑی سے۔ مجھے تو ڈاکٹروں نے ریل کا سفر کرنے کی اجازت بڑی مشکل سے دی ہے۔ ہوا میں تو میں ایک لمحہ بھی سفر نہیں کر سکتی۔"

چونکہ بات چیت میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا تھا لہٰذا ہم نے اجازت طلب کی۔

باہر آتے ہی میں نے جوش صاحب سے کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ اقتدار حاصل کرتے ہی ان سب لوگوں کی نگاہیں بدل گئی ہیں۔ صرف جواہر لال ہی ایسے ہیں جو یہ شراب پی کر نہیں جھومے۔ باقی سب جھوم اٹھے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آیا ہے۔ مجھے تو یہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔ جوش صاحب بولے معلوم نہیں میں نے کس عالم میں یہ کہا تھا۔

اس خوشگوار ملاقات کے چند دنوں بعد خبر آئی کہ سروجنی نائیڈو انتقال فرما گئیں۔ جوش صاحب اس دن لکھنؤ میں تھے۔ دہلی آئے تو میں نے دیکھا کہ اداسی اور افسردگی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس کی ملاقات کا ذکر کیا۔ آپ نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے

میں نے کہا "پرسوں "آج کل" کا پہلا شمارہ چھپ جائے گا۔ اس میں سروجنی نائیڈو کے متعلق آپ کے قلم سے ضرور کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ آپ نے چند سطور لکھ دیں۔ بولے مجھ سے کچھ نہیں لکھا جائے گا آپ ہی لکھ دیں۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ نہیں آپ ہی لکھیں، جو کچھ آپ لکھیں گے اس میں Personal Touch کی وجہ سے خاص بات پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ نے میرے اصرار سے "بلبلِ ہند" کے عنوان سے ایک صفحہ لکھ دیا۔ آخر میں آپ نے اپنے غمِ دل کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

"افسوس کہ ہندوستانی شاعروں کا اب کوئی قدردان باقی نہیں رہا۔ اس پورے برِ اعظم میں نہ کوئی مرد ہی نظر آتا ہے نہ کوئی عورت ہی دکھائی دیتی ہے جو مسز سروجنی نائیڈو کی طرح

شاعروں کی قدر کرے اور ان کے ناز اٹھائے۔

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

مسز سروجنی نائیڈو نے ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدر آباد (دکن) کے ایک بنگالی گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کے والد اگھورے ناتھ چٹوپادھیائے نظام کالج کے پرنسپل تھے۔ آپ ہندوستان کے مشہور دھارمک لیڈر شری کیشب چندسین کی زندگی سے متاثر ہو کر برہمو سماج کے حلقے میں داخل ہوئے۔ مسز نائیڈو کی والدہ کی تعلیم و تربیت بھی شری کیشب چندسین کے قائم کیے ہوئے تعلیمی ادارے بھارت آشرم کلکتہ میں ہوئی تھی۔ والدین کی زندگی کا اثر ان پر پڑنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ننھی نائیڈو بھی برہمو سماج کی تعلیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ سیاسیات اور ملک کے سوشل کاموں میں آپ کی فراخ دلی اور کشادہ نظری بہت حد تک اس تعلیم کا نتیجہ ہے۔ عالم گیر برادری کا اصول جو برہمو سماج کی تعلیم کی بنیاد کہا جا سکتا ہے، بہت حد تک آپ کی طبیعت میں گھر کر گیا۔ عالم گیر محبت کا جذبہ آخری دم تک آپ کی زندگی کا جزو بنا رہا، اور اس زمانے میں بھی جب کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں فرقہ وارانہ ذہنیت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی، آپ کا دامن اس گرد سے بالکل ملوث نہ ہوا۔ اور آپ ہر فرقے اور ہر مذہب کے افراد کے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آتی رہیں جس کے لیے آپ کے خاندان نے ہندوستان بھر میں خاص نام پیدا کیا تھا۔

مذہبی اور صوبائی تعصب کو آپ ہندوستان کے لیے ایک زہر قاتل سمجھتی تھیں اور ہمیشہ اسی کوشش میں رہیں کہ غیر ملکی غلامی کے ساتھ ہندوستان غیر ملکی سیاست کی پیدا کی ہوئی ان دو لعنتوں سے بھی نجات حاصل کر لے۔ اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے ۱۹۴۷ء میں عالم گیر مذہب کی کانفرنس کا افتتاح کیا اور افتتاحی تقریر میں ہندوستان کے تمام مذاہب سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی سمجھ اور سچی تعلیم لے کر میدان میں آئیں اور ملک کو تعصب اور تنگ نظری کے پھندے سے نجات دلائیں۔

آپ نے فقط تعصب اور فرقہ واری کے خلاف ہی اپنی آواز نہیں اٹھائی بلکہ سماج کے بوسیدہ بندھنوں کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۸۹۸ء میں آپ کی شادی ہوئی اور یہ شادی اس وقت کے فرسودہ نظام کے خلاف ایک کھلی بغاوت تھی۔ آپ خود ایک بنگالی برہمن

کے گھر پیدا ہوئیں لیکن رفیق حیات کے طور پر آپ نے ایک غیر بنگالی اور غیر برہمن شخص ڈاکٹر نائیڈو کو جو بعد میں میجر نائیڈو بن گئے منتخب کیا۔

عورتوں کی حق تلفی کی آپ نے شد و مد سے مخالفت کی اور طبقۂ نسوانی کی وکالت کے لیے آپ مانٹیگو ساؤتھ برو کمیٹی اور پارلیمنٹری جائنٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں۔ آپ کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر مانٹیگو نے آپ کو انقلابی عورت کا خطاب دیا۔

آپ نے ایک موقعے پر بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں اس صنف سے تعلق رکھتی ہوں جس میں سیتا جیسی مائیں ساوتری جیسی بہادر شخصیتیں اور دمینتی جیسی دھرماتما ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔

سیاسیات کے جسم میں آپ نے اپنے جوشِ عمل سے ایک نئی روح پھونک دی۔ آپ کا جذبۂ حب وطن بے حد و بے پایاں تھا۔ اور آپ کی شاعری میں یہ جذبہ خاص طور سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک نظم میں آپ مادرِ وطن سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

Lo ! we would thrill the bright stars
with thy story
And set thee again in the
forefront of glory.

اس قول کو آپ نے مرتے دم تک نباہا۔ آپ نے اپنے دل کش نغموں سے ملک میں چاروں طرف حب الوطنی کی آگ لگادی۔ نغمے اور خطابت دونوں طرح سے آپ نے اہلِ وطن کے دلوں کو گرمایا۔ ۱۹۰۶ء میں گوپال کرشن گوکھلے نے آپ کی ایک تقریر سن کر کہا: "آپ کی تقریر فقط خرد اور دانش مندی کا نمونہ ہی نہیں تھی بلکہ ایک فن پارہ بھی تھی۔ ہم سب سننے والوں کو ایسا معلوم ہوا گویا ہم زمین کی سطح سے بلند اٹھ گئے ہیں۔" دس سال بعد پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک موقعے پر کہا: "سروجنی نائیڈو کی تقریریں قوم پرستی اور حب الوطنی کا مجموعہ ہوتی ہیں۔" ۱۹۱۹ء میں آپ کی زندگی میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہوئی۔ آپ اس وقت لندن میں صاحبِ فراش تھیں۔ جلیانوالہ (پنجاب) کے حادثے کے متعلق پارلیمنٹ کی بحث نے آپ کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ ان حالات میں آپ نے ۱۵ر جولائی ۱۹۱۹ء کو مہاتما گاندھی کو ایک چٹھی لکھی جس میں آپ نے کہا:

"اگلے دن ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندوستانی انتقام نہیں لینا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ان پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کی تلافی کی جائے۔ ہندوستانیوں کے پاس ایک ایسا جادو ہے جس کی مدد سے وہ ہر قسم کی دشمنی اور نفرت کو محبت اور دوستی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور یہ محبت اور دوستی ہندوستانیوں اور انگریز دونوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس حادثۂ عظیم کی تلافی بحش اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہندوستانیوں کو آزاد ملک کے آزاد باشندوں کی طرح رہنے کا حق دیا جائے۔

"ڈاکٹروں نے مجھے بتایا ہے کہ میری دل کی بیماری خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے لیکن میں اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھوں گی جب تک میں دنیا کو یہ نہ بتا لوں گی کہ ہندوستان کی اس ٹریجڈی کی تلافی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ عملی طور پر اس کا کفارہ ادا کریں۔"

اس کے بعد آپ نے جہد و عمل کو شعر و سخن پر ترجیح دیتے ہوئے اسی مرد عظیم کے پہلو بہ پہلو کام کرنا شروع کر دیا جس کے نام آپ نے مندرجہ بالا چٹھی لکھی تھی۔ صحت کی خرابی آپ کو کسی قسم کی صعوبت برداشت کرنے سے نہ روک سکی۔ آپ نے گاندھی جی کے ساتھ ہر قسم کی تکلیف برداشت کی اور منزلِ آزادی کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے کبھی کبھی دریغ نہ کیا۔

شریمتی شنشماسین ایم۔ ایل۔ اے بہار نے مسز نائیڈو کے متعلق ایک مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے ان کی زندگی کے ایک نہایت حسین گوشے کو بے نقاب کیا ہے۔ آپ لکھتی ہیں کہ آپ ایک آئیڈیل ماں تھیں۔ اس لحاظ سے صرف پدمجا اور لیلامنی ہی خوش نصیب نہیں کہ انھیں مسز نائیڈو جیسی ماں ملی بلکہ ہندوستان کے وہ تمام متعدد لڑکے اور لڑکیاں بھی خوش نصیب ہیں، جنھیں مسز نائیڈو نے اپنی اولاد کہا اور ایک شفیق ماں کی طرح ان کی پرورش کی۔ غالباً ان کا یہی جذبۂ محبت تھا جس کے باعث آپ نے یوپی کی گورنر بننے پر کہا میں اس صوبے کی گورنر نہیں بلکہ گورنیس ہوں اور ان کی گورنری کا زمانہ اس بات کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس دور میں یوپی کے ہر باشندے کو اپنی اولاد سمجھا اور ایک شفیق ماں کی طرح ان کا دکھ درد دور کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہیں۔

یہی عالم گیر محبت کا جذبہ تھا جس نے شعر و نغمہ کا روپ بھر کے سروجنی نائیڈو کو بلبلِ ہند کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ان کی شاعری حسن، مسرت محبت اور غم کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ اس کی ابتدا آپ کے لڑکپن ہی میں ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک عجیب و

غریب واقعہ سننے میں آیا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

———— کہتے ہیں کہ نو برس کی عمر میں جب آپ کو گھر میں ہر وقت انگریزی بولنے پر مجبور کیا گیا تو آپ نے پہلے تو جھجک دکھائی اور پھر مصمم عزم کر کے انگریزی بولنے سے بالکل انکار کر دیا۔ اس جرم میں گھر والوں نے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا جب شام کے وقت آپ کو کمرے سے باہر نکالا گیا تو آپ نے اس بے تکلفی سے انگریزی میں بات چیت شروع کر دی۔ گویا انگریزی آپ کی مادری زبان ہو۔ اس کے چند دن بعد آپ الجبرے کا ایک سوال حل کر رہی تھیں۔ بڑی کوشش کے باوجود الجبرے کا سوال تو حل نہ ہو سکا لیکن انگریزی میں اشعار خود بہ خود موزوں ہونے لگے اور تھوڑی دیر میں صفحۂ قرطاس پر ایک مکمل نظم موجود تھی۔ اس کے بعد شعر و شاعری کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ اور بطور شاعرہ پردۂ گمنامی سے منظرِ عام پر آ گئیں۔

حصولِ تعلیم کے لیے سترہ سال کی عمر میں آپ نے انگلستان کا سفر کیا، وہاں تین سال تک کنگز کالج لندن اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ اسی دوران میں آپ کی آرتھر سائمنز اور ایڈمنڈ گاس سے ملاقات ہوئی۔ ان دونوں فن کاروں نے آپ کی شاعری کا رخ انگلستانی انداز سے ہندوستانی انداز کی جانب موڑنے میں کافی حصہ لیا۔ ان کے مشورے کے بعد سروجنی کی شاعری میں رابن اور سکائی لارک کی جگہ کوئل اور دوسرے ہندوستانی پرندوں نے لے لی۔ اور انگریزی پھولوں کی جگہ چمپا اور گلاب آ گئے۔ گویا انگلستان جا کر شاعرہ کے طور پر آپ کا دوبارہ جنم ہوا۔ آپ کا کلام اس وقت تین مجموعوں "سنہری دہلیز" The Golden Threshold (۱۹۰۵ء) "طائرِ وقت" The Bird of the Time (۱۹۱۲ء) اور "بال شکستہ" The Broken Wing (۱۹۱۵ء) کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ "سنہری دہلیز" کی اشاعت تک آپ کو بطور شاعرہ کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب یہ کتاب انگلستان میں پہنچی تو وہاں کے اہلِ نظر طبقے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ادبی جرائد میں اس کے متعلق نہایت قابلِ قدر تبصرے شائع ہوئے۔ ایک رسالے نے لکھا کہ یہ چھوٹا سا مجموعۂ سخن اس اعتراض کا مسکت جواب ہے کہ عورتیں شعر نہیں کہہ سکتیں۔ ایک اور جریدے نے لکھا "آپ کی شاعری میں نغماتی کیفیات کا ایک طوفان موجزن ہے۔ آپ کا بلند پروازِ تخیل اور شدید جذباتی کیفیت ایک انوکھی ادا سے پردۂ تغزل میں زمزمہ پرداز ہے۔" ایک اور رسالے نے اس مجموعے کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں "حسن اور انفرادیت جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔"

"طائر وقت" اس سے سات سال بعد شائع ہوئی۔ اس کا پیش لفظ ایڈمنڈ گاس نے لکھا۔ ایڈورڈ تھامسن نے اس مجموعے کے متعلق کہا کہ "اس کے الفاظ میں حسن اور معانی میں عظمت پنہاں ہے۔"

"بال شکستہ" ۱۹۱۷ء میں چھپی۔ اس کے بعد آپ کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا "بال شکستہ" کی اشاعت کے بعد نظمیں تو آپ نے اکثر کہیں لیکن انھیں یکجا کر کے مجموعے کی صورت نہیں دی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ سیاسی سرگرمیاں انھیں شعر و سخن کے ماحول سے بہت دور لے گئیں اور ڈاکٹر امرناتھ جھا کے الفاظ میں اگر آپ اپنی قوت اسمبلی اور کونسل ہال کی تقریروں اور حصول آزادی کے لیے عوام کی عملی تنظیم میں صرف نہ کر دیتیں تو اس وقت تک انگریزی ادب میں بے شمار آسمانی نغمات کا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر جھا نے آپ کی موت کے بعد آپ کی شاعری کے متعلق ایک مختصر سا مقالہ لکھا ہے جس کا ایک حصہ میں یہاں درج کرتا ہوں:

"مسز نائیڈو کی سخن گوئی کی ابتدا بہاریہ نظموں سے ہوئی۔ یہ نظمیں تعداد میں کم از کم تیرہ ہیں اور ان میں آپ نے نہایت خوب صورتی سے مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے فطرت کی آواز اور خوشبو کو سمو دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے کلام میں خالص ہندوستانی زندگی کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس ضمن میں آپ کے عوامی گیت اور تاریخی اور نیم تاریخی نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ "دیہات" اور "بچے" بھی آپ کا خاص موضوع ہیں۔ لیکن جس موضوع پر آ کر آپ کے فکر و نظر کا مطالعہ ایک گہری صورت اختیار کر جاتا ہے وہ ہے "عشق و محبت" اور عشق و محبت بھی وہ جسے جاوداں اور ہر دم جواں کہہ سکیں۔

اپنی پہلی تصنیف "طائر وقت" میں آپ نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ تنقیدی جملہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ حسنِ الفاظ اکثر حسنِ تغزل پر سبقت لے گیا ہے لیکن دوسری کتاب "سنہری دہلیز" میں تازگی، بے ساختگی اور ندرت فکر کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے اور اس کتاب میں ارتباط صرف و معنی صحیح معنوں میں اختلاطِ جان و تن کی صورت میں نظر آتا ہے۔ "بال شکستہ" میں پختگیِ کلام اور شدت تاثر دونوں اپنے جوبن پر ہیں۔

ایک خوبی جو ان تینوں کتابوں میں خاص طور پر نظر آتی ہے وہ ہے خوب صورت ٹکڑوں اور ترکیبوں کا استعمال۔ خوب صورت ٹکڑوں کے استعمال میں مسز نائیڈو کو ید طولیٰ حاصل ہے اور کلام میں یہ حسن پیدا کرنا ہر فن کار کے بس کی بات نہیں۔ ان حسین ٹکڑوں میں

سے ایک ملاحظہ فرمائیے :

Like a star in the dew of our song
silver breasted moonbeam of desire
conquer the sorrow of life with the sorrow
of song ; a voiceless captive to my
conquering song'. brows anointed with
perpetual weariness : all my blossoming
hopes unharvested languid and sequestered
ease ; Tomorrow's unborn griefs depose
the sorrows of our yesterday ; the heavenward
hunder of our soul ; the mystic silence that
men call death the abysmal
anguish of her tears ; the memorial sorrow
that sullied a by ; gone dream ; the radiant
promise or renascent morn ; sweet comrades
of a lyric spring ; the radiant silence of
my sleepless pain', fallen from its
estate of laught——one can cull such gems
in ample measure, 'Tis sufficient to say
that here is God's plenty.'

اگرچہ آپ کی اکثر نظموں کا موضوع حزن والم ہے اور یہ نظمیں اول سے آخر تک آنسوؤں میں بھیگی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن یہی نظمیں زندگی کے حسن اور اس کی لطافتوں، تبسم اور قہقہوں سے بھی مالا مال ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ شاعرہ نے نغمے کی قوت سے زندگی کے تلخ اور علیل پہلوؤں پر فتح حاصل کی ہے۔ حبِ وطن کے بے پناہ جذبے نے ان میں جس طرح کی جرأت پیدا کر دی تھی اس نے ان کو ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا اور یہ

خصوصیت ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ بطور شاعرہ کے آپ کا مرتبہ جانچنے کے لیے مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔ نغمے کا بہاؤ اور خیالات کی سنجیدگی دونوں ایک دوسرے پر غالب نظر آتے ہیں :

Weavers, weaving at break of day
why do you weave a garment so gay ?
Blue as the wing of a halcyon wild
We weave the robes of a new born child

Weavers weaving at a fall of night
Why do you weave a garment so bright
Like the plumes of a peacock purple and green
We weave the marriage-weils of a queen

weavers weaving solemn and still
what do you weave in the moonlight chill
white as a feather and white as a cloud
We weave a dead Man's funeral shroud ;

'O brilliant blossoms that strew my way
You are only woodland flowers they say
But I sometimes think that perchance you are
Fragments of some new fallen star

Or golden lamps for a fairy shrine
Or golden pitchers for a fairy wine
Perchance you are, O frail and sweet
Bright anklet-bells from the wild spring's feat

Or the gleaming tears that some fair bride shed
Remembered her lost maindenhead
But now, in the memorial dusk you seem
The glimmering ghost of a bygone dream

"پردہ نشیں"۔ "گلی کی آوازیں"۔ "چوڑیاں والا"۔ "امام باڑہ" اور ایسی ہی دوسری نظموں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سروجنی نائیڈو کا اندازِ بیان خود ان کی اپنی ایجاد ہے اور ان کا طرزِ سخن کسی اور فن کار کی تقلید کا مرہونِ منت نہیں۔ ان کا اندازِ بیان بھی اپنا ہے اور موضوع بھی، نغمے بھی اور نالے بھی۔ ابتدا میں اگرچہ ٹینی سن، شیلے اور سوِن برن کی اسٹائل سے آپ متاثر نظر آتی ہیں۔ لیکن بعد میں ان کا طرز کلام کسی اور کا تتبع نہیں بلکہ خود نائیڈو کی تخلیق اور نائیڈو ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔"

آپ جب خود کسی مجمعے میں اپنے اشعار پڑھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سارے مجمعے پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ نغمے کا سیل رواں خاموش فضا میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا تھا، اور جب تک آپ اپنی نظم ختم نہ کر لیتی تھیں سننے والے بے حس و حرکت ایک عجیب کیفیت میں گم رہتے تھے۔

میں نے ۱۹۳۳ء میں بریڈلہال ہاؤس لاہور کے مشاعرے میں جو رابندر ناتھ ٹیگور کے اعزاز میں مسز نائیڈو کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ ان کا کلام ان کی زبان سے سنا تھا۔ اس وقت کی کیفیت میرے احساس میں آج بھی زندہ و بیدار ہے۔ لیکن میں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مذکورہ اجتماع لاہور کی ادبی زندگی میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اس میں اردو کے بڑے بڑے شعراء کے علاوہ ٹیگور اور نائیڈو نے بھی اپنا کلام پڑھا تھا۔ اس مشاعرے میں بھی مسز نائیڈو کی اردو سے دل چسپی کی ایک مثال سامنے آئی اور وہ یہ کہ منتظمینِ مشاعرہ کی بدانتظامی کہیے یا خوش انتظامی کہ مشاعرہ سننے کی آرزو میں سرِ شام ہی سے لاکھوں اشخاص جوق در جوق بریڈلا ہال کے احاطے میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مشاعرہ شروع ہونے تک ہال میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور باہر کے انبوہ میں کوئی کمی نظر نہ آ رہی تھی۔ انسانی سروں کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کسی ادبی جلسے کے سلسلے میں ایسا اجتماع اور عوام کا اشتیاق آج تک نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ منتظمین نے حتی الامکان ہجوم کو مشاعرہ گاہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس پر مقابلہ شروع ہوا اور آناً فاناً دروازوں کو توڑ کر وہ سیلاب اندر داخل ہو گیا۔

خدا جانے اس طوفانِ بدتمیزی میں منتظمینِ مشاعرہ ٹیگور اور نائیڈو کو کس طرح ہال میں

لانے اور انھیں کرسیوں پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ بہرحال دوسرے مدعو شعرا وہاں پہنچے تو منتظمین کا کوئی پتہ نہ تھا اور اندر جانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اب واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہی فیصلہ ہو رہا تھا کہ منتظمین میں سے کسی کو معلوم ہوا کہ جن شعرا کو مدعو کیا گیا ہے وہ واپس جا رہے ہیں۔ وہ لوگ دوڑے دوڑے آئے اور پولیس کی امداد سے راستہ بنا کر شعرا کو ہال میں لے گئے۔ اس افراتفری میں پنڈت ہری چند اختر اس قافلے سے بچھڑ گئے اور مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے۔ منتظمین نے یہ ساری روداد صدرِ جلسہ مسز نائیڈو سے بیان کی۔ آپ نے اہلِ پنجاب کو ان کی بدانتظامی پر بہت سخت لفظوں میں جھاڑ ڈالی! ... جب انھیں بتایا گیا کہ پنڈت ہری چند اختر ہجوم کے عدم تعاون کی وجہ سے قافلے سے بچھڑ گئے ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں پنڈت ہری چند اختر کے نام اور کلام سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مشاعرہ گاہ کے دروازے تک آ کر ان کا مشاعرے میں شریک نہ ہو سکنا اہلِ پنجاب کے لیے باعثِ ندامت ہے۔ انھوں نے منتظمین سے کہا کہ جیسے بھی ہو پنڈت ہری چند اختر کو تلاش کیا جائے تاکہ وہ اس مشاعرے میں شرکت کر سکیں۔ لیکن نہ معلوم اختر صاحب کہاں چلے گئے تھے۔ منتظمین انھیں تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

افسوس کہ جب ہندوستان کے دن پھرے اور اردو ادب کا مسز سروجنی نائیڈو سے عملی طور پر فیض یاب ہونے کا وقت آیا تو موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں اپنے ملک اور اپنے ملک کے علم و ادب سے چھین لیا۔ اور وہ شمع جو اپنی ضیا سے دور دور تک فضا کو نورانی بنا رہی تھی ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

[illegible] ۱۹۷۵ء

عبدالقادر سروری

غالباً ۱۱ر یا ۱۲ر مارچ کی بات ہے میں انڈین ایرلائنز کے دفتر میں دہلی کے لیے اپنی نشست مخصوص کرانے پہنچا ۱۳ر مارچ کو مجھے شنکر شاد مشاعرے میں شریک ہونا تھا — کہ کشمیر یونی ورسٹی کے ایک طالب علم نے اچانک یہ خبر سنائی — سروری صاحب کا کل رات ہسپتال میں انتقال ہو گیا — میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ابھی پرسوں ہی تو ڈاکٹر گیان چند جین نے جموں سے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ سروری صاحب سری نگر روانہ ہو گئے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ میں نے اپنے توسیعی لیکچروں کی تاریخ میں تبدیلی کے لیے ڈاکٹر گیان چند کو فون کیا۔ ابھی میں نے بات شروع ہی کی تھی کہ انھوں نے میری آواز کو سروری صاحب کی آواز سمجھا اور کہا کہ "آپ ابھی تک یہیں ہیں، سری نگر نہیں گئے"؛ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب، میں جگن ناتھ آزاد ہوں اور سری نگر سے بات کر رہا ہوں" وہ بولے "میں سمجھا شاید سروری صاحب جموں سے بات کر رہے اور وہ ابھی تک سری نگر روانہ نہیں ہوئے"۔ پھر انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ حیدر آباد سے واپس آتے ہوئے وہ میرے یہاں جموں میں مقیم رہے اور کل ہی وہ بس سے سری نگر روانہ ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ ان کی سری نگر واپسی پر میں ان سے ملتا سروری صاحب اس سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔

ع اے ہوس اِخوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار

سروری صاحب جواہر نگر میں مقیم تھے میں تلسی باغ میں ہوں۔ یہ قریب قریب پڑوس

کا معاملہ ہے لیکن اس سے زیادہ قریب وہ ہے جو ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے تھا اور جو قریب قریب ربع صدی پر پھیلا ہوا تھا۔

سروری صاحب کے نام سے میں اس زمانے میں آشنا ہو چکا تھا جب میں کالج میں داخل ہوا تھا اور ان کی کتابیں دیکھنے کو ملی تھیں۔ لیکن خط و کتابت کا آغاز ۱۹۳۷ء میں ہوا اور وہ بھی یوں کہ انھوں نے اپنی ایک تصنیف (غالباً جدید اردو شاعری) کی ابتدا میں میرے والد محترم کی ایک نظم شعر و شاعری کے بارے میں شامل کی تھی اور اس پر والد کا نام نہیں تھا۔ میں نے یہ نظم اس کتاب میں دیکھی تو سروری صاحب کو ایک مؤدبانہ لیکن قدرے شکایت کے انداز میں خط لکھا کہ والد کی یہ نظم آپ نے بغیر نام کے شائع کی ہے۔ اس کے جواب میں سروری صاحب کا ایک طویل خط ملا۔ خط کیا تھا محبت کا ایک دریا تھا۔ انھوں نے اس میں مجھے یقین دلایا تھا کہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس کوتاہی کی تلافی کر دی جائے گی۔

یہ میرے اور سروری صاحب کے درمیان خط و کتابت کی ابتدا تھی۔ اس کے کچھ مدت بعد انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ زورؔ صاحب ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے محرومؔ صاحب کا مجموعۂ کلام شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ مجموعہ لاہور میں چھپوا لیں۔ ادارہ ادبیات اردو کتابت طباعت وغیرہ کا سارا بل ادا کر دے گا۔ اور کتاب کا اسٹاک ہم لوگ حیدر آباد منگوا لیں گے چند روز بعد اسی مضمون کا ایک خط زورؔ صاحب کی طرف سے موصول ہوا۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ میں نے راولپنڈی والد محترم کو خط لکھا کہ ایک انتخاب اپنے کلام کا مجھے بھیج دیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے چھپے گا لیکن والد نے غالباً اپنی طبعی بے نیازی کی بنا پر میرے خط پر کوئی توجہ نہ کی اور یہ تجویز دھری کی دھری رہ گئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا۔ میں لاہور چھوڑ کے دہلی آ گیا۔ اس زمانے میں میری نظموں

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھینکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری

اور

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

کا دونوں ملکوں میں غلغلہ تھا۔ دہلی آتے ہی گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی اردو ایسوسی ایشن

کی طرف سے مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ مدراس میرے لیے نیا شہر تھا۔ وہاں جانے اور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اور سید عبدالوہاب بخاری سے ملنے کا اشتیاق تو تھا ہی ساتھ ہی یہ اشتیاق بھی تھا کہ راستے میں حیدرآباد میں رک کے زورؔ صاحب اور سروریؔ صاحب سے ملاقات کا موقع بھی مل جائے گا۔ چنانچہ میں نے زورؔ صاحب اور سروریؔ صاحب کو اپنے اس مجوزہ پروگرام سے مطلع کیا۔ دونوں نے یہ تجویز پسند کی اور مدراس جاتے ہوئے میں نے پہلے حیدرآباد کا رخ کیا۔

اسٹیشن پر زور صاحب اور سروری صاحب دونوں موجود تھے ان کے علاوہ خواجہ حمیدالدین شاہد، نصیرالدین ہاشمی مرحوم اور رضا بن بخاری بھی تھے۔ ان تمام حضرات سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور ع من بہ بوئے مست ساقی پُر دہد میخانہ را، والا معاملہ تھا۔

نام پلی اسٹیشن سے ہم سب لوگ زور صاحب کے دولت کدے کو روانہ ہوئے۔ وہاں میں نے دو تین روز قیام کیا۔ اس زمانے میں زورؔ صاحب چادر گھاٹ آرٹس کالج کے پرنسپل تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کی جگہ پروفیسر سروری صدر شعبۂ اردو کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اسی ملاقات میں سروری صاحب نے مجھے یونیورسٹی میں "ہندوستان میں اردو کا مستقبل" کے عنوان پر لیکچر کی دعوت دی اور میں پہلی بار عثمانیہ یونیورسٹی کے در و دیوار سے آشنا ہوا۔

اس کے بعد سروری صاحب کئی بار دہلی آئے۔ یونیورسٹی کے کام کے سلسلے میں۔ ہر بار ان سے ملاقات ایک انشراحِ قلب کا باعث ہوتی تھی۔

خواجہ احمد فاروقی دہلی کالج میں لیکچرار تھے۔ مجھے پوری طرح سے یاد نہیں کہ دہلی کالج میں جگہ خالی تھی اور آپ اس کے امیدوار تھے یا آپ کی ڈاکٹریٹ کے انٹرویو کا معاملہ تھا۔ بہرطور بورڈ میں سروری صاحب بھی تھے۔ انھوں نے اپنے دہلی آنے کی اطلاع مجھے دی۔ میں اسٹیشن پر پہنچا خواجہ صاحب نے ان کے قیام کا انتظام دہلی کالج میں کیا تھا۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں خود بھی دہلی کالج ہی میں مقیم تھے لیکن چونکہ سروری صاحب اس بورڈ کے ممبر تھے جس کے سامنے خواجہ صاحب کو ایک امیدوار کے طور پر پیش ہونا تھا اس لیے سروری صاحب نے دہلی کالج میں قیام مناسب خیال نہ کیا۔ اس وقت تک ہم میں بے تکلفی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ سروری صاحب نے مجھے تنہائی میں لے جا کے کہا کہ میرا دہلی کالج میں ٹھہرنا موزوں نہیں ہے۔ میں آپ کے یہاں قیام کروں گا۔ میں نے کہا۔ سروری صاحب میں تو اسی خیال سے اسٹیشن پر آیا تھا کہ آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا وہاں والد بھی آپ کے منتظر ہیں لیکن خواجہ احمد فاروقی میرے بھائی ہیں اور

محترم دوست ـــــــــ انھوں نے چونکہ آپ کی آمد سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ کے قیام کا انتظام ان کے یہاں ہے اس لیے میں نے دخل دینا مناسب خیال نہیں کیا اور اس وقت شاید خواجہ صاحب کو بھی آپ کا یہاں سے جانا ناگوار گزرے۔ اب سروری صاحب کے لیے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ مروت ان کے اخلاق کا ایک خاص پہلو تھا۔ چنانچہ انھوں نے وہاں سے منتقل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن جب وہ حیدرآباد جانے لگے تو انھوں نے پھر مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب اس عہدے کے لیے بہترین امیدوار تھے۔ ہم لوگوں کو انھیں منتخب کرنا ہی تھا۔ چنانچہ فیصلہ بھی یہی ہوا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں میرا اس موقعے پر ان کے یہاں قیام کرنا کہاں تک مناسب تھا۔

یہ نزاکت محض خواجہ احمد فاروقی کے انتخاب کے پیشِ نظر ہی پیدا ہو گئی تھی ـــــــ ورنہ اس کے بعد سروری صاحب کئی بار دہلی میں خواجہ صاحب کے یہاں مقیم ہوئے خواجہ صاحب کا مکان شہر سے بہت دور یونی ورسٹی انکلیو میں ہے لیکن خواجہ صاحب کا اخلاق، ان کی پرتکلف دعوت اور سروری صاحب سے اشتیاقِ ملاقات مجھے ہر بار خواجہ صاحب کے دولت کدے پر لے گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ میرا حیدرآباد آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یوں تو مخدوم اور اریب سے بھی تعلق خاطر کم نہیں تھا لیکن مخدوم اور اریب کا زیادہ تر وقت جیلوں میں کٹ رہا تھا میں گورنمنٹ کا ملازم، ترقی پسند تحریک سے پوری ہمدردی رکھنے اور مخدوم و اریب سے بہت قریب ہونے کے باوجود ان سے ملنا جلنا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ وہ زمانہ بڑا نازک تھا۔ اگرچہ وزیر اعظم جواہرلال نہرو تھے۔ لیکن ہماری وزارت کے سربراہ سردار پٹیل تھے۔ اور اشتراکیت اور ادب کی ترقی پسند تحریک کی جانب ان کا جو رویہ تھا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے میں جب بھی حیدرآباد آتا تھا۔ مخدوم سے ملنے جلنے میں بہت احتیاط برتتا تھا۔ اور جس حلقے میں میرا اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا وہ زیادہ تر ادارۂ ادبیات اردو کا حلقہ تھا اور زور صاحب کے بعد سروری صاحب اس حلقے کے روحِ رواں تھے۔

اس زمانے میں زور صاحب اور سروری صاحب یک جان و دو قالب تھے۔ ان میں باہمی کشیدگی بہت بعد میں شروع ہوئی لیکن اس کے باوجود دونوں کے ساتھ میرے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ یہ بات زور صاحب کو بھی معلوم تھی اور سروری صاحب کو بھی۔ لیکن کیا مجال جو ان دونوں میں سے کسی کے ماتھے پر بل آیا ہو۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں جب کبھی شکایتاً بات کرتے تھے تو اس یقین کے ساتھ کہ مجھی تک محدود رہے گی

اور کسی تک نہ پہنچے گی۔ اس قسم کی باتیں بے شمار ہیں لیکن جب ان کی زندگی میں کوئی بات میری زبان پر نہیں آئی تو اب ان کی موت کے بعد اس قسم کی باتوں کا کیوں ذکر کیا جائے۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زوؔر صاحب یا سروری صاحب نے اس قسم کی کوئی بات عیب جوئی یا غلبت کے خیال سے نہیں کہی بلکہ چونکہ مجھے اس بات سے بے حد دکھ ہوتا تھا کہ دو ایسے دوستوں میں جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے، رنجش پیدا ہو گئی ہے اور میری یہ آرزو رہتی تھی کہ ان کے تعلقات ایک بار پھر خوش گوار ہو جائیں تو میں اکثر کرید کر پوچھتا تھا کہ آپ دونوں کی دوستی کیوں کشیدہ خاطری میں تبدیل ہو گئی۔ وہ جواب میں کچھ نہ کچھ بتا دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں میرے شعری مجموعے "بیکراں" اور "ستاروں سے ذروں تک" منظر عام پر آئے۔ سروری صاحب نے ان دونوں کتابوں پر یکے بعد دیگرے حیدرآباد ریڈیو سے تبصرے کیے اور ان کی نقول مجھے بھجوائیں۔ میری شاعری میں کوئی خاص بات ہو یا نہ ہو لیکن سروری صاحب کو اس میں ہمیشہ محاسن ہی محاسن نظر آئے چنانچہ میں نے انھیں ایک بار علامہ اقبالؒ کا یہ شعر لکھا:

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

اسی زمانے میں ماہر القادری نے میرے شاعرانہ محاسن کے ساتھ ہی ساتھ "بیکراں" کی زبان و بیان کے اسقام کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔ سروری صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ بھئی یہ شعر تم نے مجھے کیوں لکھ کے بھیجا ماہر القادری کو بھیجو جو تمھارے عیب جو ہیں میں تو عیب جو نہیں محاسن شناس ہوں۔ مجھے فوراً محسوس ہوا کہ شعر کی نزاکت پر میری نظر نہیں گئی تھی اور مجھے سروری صاحب کو یہ نہیں لکھنا چاہیئے تھا۔

۱۹۵۸ء میں میں نے اپنے والدِ محترم کا مجموعۂ کلام "نیرنگ معانی" مرتب کیا اور دیباچے کے لیے سروری صاحب سے درخواست کی۔ انھوں نے بلا توقف چند ہی دنوں میں دیباچہ لکھ کے مجھے بھیج دیا۔ اس دیباچے میں انھوں نے والد کے بارے میں نہایت محبت و عقیدت سے لبریز جملے لکھے اور اس بات کا خاص طور سے ذکر کیا کہ آج سے کوئی تیس برس قبل جب میں اپنی تصنیف "جدید اردو شاعری" کے لیے مواد اکٹھا کر رہا تھا مجھے پہلے پہل حضرت محروم کے کلام کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت بھی وہ اردو کے سر بر آوردہ شاعر تسلیم کیے جاتے تھے

...... حضرت محروم کی حالت ایک ایسے تناور درخت کی سی ہے جو آندھیوں اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے گو اس کے ثمر اطراف کے اثرات سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔

والد کی ذات کے ساتھ سروری صاحب کو خاص عقیدت تھی اور مجھے کوئی ایسا موقع یاد نہیں کہ اگر انھوں نے ہمارے یہاں قیام نہیں کیا تو دہلی آکر والد سے ملنے ہمارے گھر نہ آئے ہوں

سری نگر میرا تبادلہ مارچ ۱۹۶۸ء میں ہوا۔ سروری صاحب مجھ سے پہلے یہاں آچکے تھے یہاں اگرچہ آتے ہی میں اپنے فرائضِ منصبی میں اس بری طرح سے گھر گیا کہ دوستوں اور احباب سے ملاقات ایک ناممکن سی بات ہو گئی اور مدت تک میں سروری صاحب سے ملنے نہ جا سکا۔ نہ یونی ورسٹی میں نہ ان کے دولت کدہ پر۔ لیکن سروری صاحب دس پندرہ روز میں دو بار مجھ سے ملنے میرے دفتر آئے اور دونوں بار مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو یونی ورسٹی میں دعوت دینا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکالیے۔ لیکن میں یونی ورسٹی کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ میں یہاں آیا تو مدت تک یہ کیفیت رہی کہ میرا ایک قدم سری نگر میں ہے دوسرا جموں میں۔ ان حالات میں یونی ورسٹی کے کسی ادبی پروگرام کے لیے وقت نکالنا آسان نہ تھا۔ میں سروری صاحب کے گھر دو تین بار ان سے ملنے گیا لیکن یونی ورسٹی کے لیے وقت نہ نکال سکا۔

پروفیسر مونس رضا انجینئرنگ کالج کے پرنسپل تھے۔ ایک آل انڈیا مشاعرے کے موقع پر انھوں نے اپنے کالج میں مشاعرے کا اہتمام کیا۔ ٹیلی فون پر انھوں نے مجھ سے فرمائش کی اور کہا کہ میں سات بجے گاڑی بھجوا دوں گا۔ آپ تیار رہیے۔ میں نے اپنی مصروفیات کی روداد تو ان سے بیان کی لیکن یہ ضرور کہا کہ آپ گاڑی بھجوانے کی زحمت نہ کریں میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ مونس رضا شاعروں کی نبض پہچانتے تھے۔ بھانپ گئے۔ بولے اس اقرار میں انکار پنہاں ہے میں گاڑی ضرور بھیجوں گا۔ آپ تیار رہیے گا۔

انھیں غالباً نہ مجھ پر بھروسہ تھا نہ گاڑی پر۔ چنانچہ انھوں نے سروری صاحب سے کہا کہ میں تو مشاعرے کے انتظام میں مصروف ہوں آپ آزاد کو لانے کی تکلیف گوارا کریں۔ سروری صاحب میرے بزرگ تھے لیکن اس کے باوجود گاڑی لے کر میرے غریب خانے پر پہنچے۔ وہاں انھیں پتہ چلا کہ میں ابھی دفتر سے نہیں آیا ہوں چنانچہ وہ دفتر تشریف لائے۔ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں بقول جوش ملیح آبادی فائیلوں کا مفعول بنا بیٹھا تھا۔ مجھے اس عالم میں دیکھ کے بہت حیران

ہوئے اور بولے یہ کیا طریقہ ہے کام کرنے کا۔ چھوڑیئے ان فائیلوں کو اور میرے ساتھ چلیے۔ مونس رضا صاحب منتظر ہیں۔ میں نے اپنی میز سے کاغذ سمیٹے اور فوراً ان کے ساتھ چل پڑا یہ ان کی بزرگانہ شخصیت کا خاص پہلو تھا۔

۱۹۶۹ء میں میں لیہہ جا رہا تھا کہ راستے میں میری گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا۔ اور میری آٹھ پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ میں پہلے کرگل پھر لیہہ اور پھر سری نگر کے فوجی ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ ابھی مجھے لیہہ آرمی ہاسپٹل سے سری نگر ہاسپٹل میں منتقل ہوئے ایک آدھ دن ہی ہوا تھا اور میں درد کے عالم میں پڑا تھا کہ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سرور صاحب اپنا بریف کیس ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی نقش بہ دیوار بن کے رہ گئے۔ ان کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ میرا تو خیال تھا معمولی چوٹ ہوگی لیکن چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے جسم کا سارا خون ہی سوکھ گیا ہے۔ میری زبان پر بے اختیار غالب کا یہ شعر آیا۔ قدرے تصرف کے ساتھ:

دل میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

میری آواز سے انھوں نے جان لیا کہ درد زیادہ ہے اور بات کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے گھنٹی آپ کے پلنگ کے ساتھ لگی ہے۔ آپ اسے بجا کر ڈاکٹر یا نرس کو کیوں نہیں بلا لیتے تاکہ وہ کوئی دوا دے کے وقتی طور پر ہی اس درد کا علاج کر دیں میں نے کہا " دو ایک بار نرس کو بلایا۔ اس نے انجکشن دیا جس سے درد تو کم ہو گیا لیکن بہت دیر تک جی متلاتا رہا۔ اس کیفیت کے مقابلے میں یہ درد زیادہ قابلِ برداشت ہے۔" یہ سن کر ان کا چہرہ اور متفکر ہو گیا۔ بڑی سادگی سے کہنے لگے۔ میں آہستہ آہستہ پسلیوں کو دبا دوں شاید درد کم ہو جائے۔ میں نے کہا یوں تو آپ کا ہاتھ لگانا مسیحائی اثر رکھے گا لیکن ایسا نہ ہو درد کے ساتھ ہی پسلیاں بھی جاتی رہیں۔ اس پر حسبِ دستور خوب زور سے ہنسے اور بولے مجھے یقین ہے آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ آپ نے حادثے کا کوئی نفسیاتی یا جذباتی اثر نہیں لیا ہے۔

شروع شروع میں پسلیوں کے درد کے باعث میرے لیے کروٹ بدلنا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن ایک ہی پہلو لیٹا لیٹا میں تھک گیا تھا۔ میں نے پوچھا اجازت ہو تو میں ذرا کروٹ بدل لوں اگرچہ بائیں طرف میں ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں لیٹ سکوں گا۔ بولے میں مدد کرتا ہوں۔ میں نے

کہا مجھ میں یہ ہمت نہیں اور آپ شاید اس فن سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ میں نے گھنٹی بجائی۔ نرس آئی۔
اس نے کروٹ بدلنے میں میری مدد کی۔ زیادہ سے زیادہ میں ایک منٹ بائیں پسلیوں کے سہارے لیٹا
ہوں بہت تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے پھر دائیں کروٹ لٹا دیا اور کمرے میں مسکراہٹیں بکھیرتی چلی گئی۔ اس
کے جاتے ہی سروری صاحب بڑے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے اب میں سمجھ گیا ہوں۔ درد ورد نہیں ہے
حادثے کا بھی غالباً بہانہ ہی ہے۔ نرسنگ ہوم کی فضا سازگار آگئی ہے۔ اسی طرح سروری صاحب
ہر چوتھے پانچویں دن بلاناغہ آتے رہے۔ میرے پاس بیٹھتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جس سے میری
تنہائی کا بھی مداوا ہوتا اور میرے مرض کا بھی۔

ایک دن جب میں بستر سے اٹھنے اور دو چار قدم چلنے کے قابل ہو گیا اور اپنے کمرے کی
تنہائی سے اکتا بھی چکا تھا تو دیوار کا سہارا لے کر باہر نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سو پچاس
گز دور ایک جنرل وارڈ تک جس میں فوج کے میجر زیر علاج تھے، پہنچ گیا۔ وہاں میں ایک خالی پلنگ
پر لیٹ گیا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اسی طرح دیوار کا سہارا
لیتے ہوئے جب واپس اپنے کمرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سروری صاحب کا بریف کیس کمرے
میں رکھا ہے لیکن وہ موجود نہیں ہیں۔ میں تھکا ہوا تو تھا ہی، آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر
میں سروری صاحب آئے چہرے پر پریشانی کے آثار۔ بولے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ کو اسٹریچر پر
لٹا کر آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا ہے۔ میں اس وقت آپریشن تھیٹر سے آرہا ہوں۔ وہاں اندر تو
کسی نے جانے نہیں دیا۔ پریشانی کے عالم میں واپس آگیا کہ کم از کم آپ کے گھر کے لوگوں کو
ٹیلی فون پر اطلاع تو دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے دیکھ کر ان کی جان میں جان آگئی ہو۔

چند روز کے بعد میں اچھا ہو کے گھر واپس آگیا لیکن ابھی پوری طرح چلنے پھرنے کے قابل
نہیں تھا۔ سروری صاحب اسی باقاعدگی سے میرے غریب خانے پر تشریف لاتے رہے اور
یہ حقیقت ہے کہ ان کے آنے سے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا درد بالکل ہی غائب
ہو گیا ہے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے یونی ورسٹی کی طرف سے عن قریب آپ کو اقبال پر توسیعی لیکچروں
کی دعوت ملے گی۔ کون سی تاریخ موزوں رہے گی؟ میں نے کہا سروری صاحب کم از کم دو مہینوں کی
مہلت درکار ہوگی۔ بولے ہاں، اتنی مہلت ضرور ملے گی۔ کئی روز گزر گئے دعوت نامہ نہ آیا۔ ایک دن سر راہ
ملاقات ہو گئی۔ میں نے سوچا وہ خود دعوت نامے کا ذکر کریں گے۔ وہ خاموش رہے۔ میں نے بھی کہنا

مناسب نہ سمجھا۔ کوئی پانچ سات ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں اور دنیا بھر کی باتیں بھی لیکن توسیعی لیکچروں کا کوئی ذکر سروری صاحب نے نہ کیا۔ ایک دن کشمیر کے مشہور مصور بنسی پاریو کے گھر میں دعوت تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس روز میری پسلیوں میں درد پھر سے تھا اور مجھے بیٹھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ میں دعوت میں پہنچا تو سروری صاحب پہلے سے موجود تھے میں ان کے پاس جا کے بیٹھ گیا لیکن درد کی وجہ سے طبیعت میری بجھی بجھی سی تھی۔ کھڑا رہنا تو میرے لئے مقابلتاً آسان تھا لیکن بیٹھنا اور وہ بھی فرش پر۔ اس درد کے عالم میں مشکل تھا۔ انھوں نے مزاج پوچھا۔ میں نے رسمی طور پر شکریہ ادا کیا۔ اب میں تو درد سے پریشان تھا جس کا ذکر میں بھری محفل میں کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن سروری صاحب نے اسے کچھ اور ہی سمجھا۔ کھانے کے بعد ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو سروری صاحب کے دل میں خلش سی رہ گئی۔ دوسرے دن یونی ورسٹی جاتے ہوئے میرے دفتر میں تشریف لائے۔ درد اس دن بھی تھا اور میرے چہرے سے شگفتگی پہلے دن کی طرح اب بھی غائب تھی بولے آپ کی ناراضگی بجا ہے لیکن ہوا یوں کہ آپ کو دعوت نامہ ہم لوگ بھیجنے ہی والے تھے کہ بمبئی سے ـــــــ صاحب آ گئے اور انھوں نے فرمائش کی کہ مجھے توسیعی لیکچروں کی دعوت دیجیے۔ مجبوراً ان کی فرمائش کی تعمیل کرنا پڑی۔ دوسری بار آپ کے نام دعوت نامہ جاری ہونے ہی والا تھا کہ علی گڑھ سے فلاں صاحب کا خط آیا کہ میں سری نگر آنا چاہتا ہوں توسیعی لیکچروں کی صورت پیدا کیجیے۔ اب آپ جانتے ہیں کہ ان کی بات ٹالنا میرے لیے مشکل تھا۔ آئندہ برس آپ ہی کو دعوت دی جائے گی۔ میں یہ سارا بیانِ صفائی سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا قسمیں کھا کر ان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔ توسیعی لیکچر کا کیا ہے اب کے نہیں تو آئندہ برس دے دوں گا۔ میں قطعاً آزردہ خاطر نہیں ہوں۔ پرسوں سے میری پسلیوں میں پھر درد ہے۔ میری خاموشی کا سبب یہی ہے وغیرہ۔ خدا جانے انھیں میری باتوں کا یقین آیا یا نہیں لیکن میں نے انھیں پورا یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس درد کی وجہ سے میری طبیعت بجھی بجھی سی ہے۔ میں آپ سے ہرگز خفا نہیں ہوں۔

کچھ مدت بعد کرشن چندر سری نگر آئے۔ اُن کے اعزاز میں یونی ورسٹی میں جلسہ ہوا۔ سروری صاحب نے صدارت کا اعزاز مجھے بخشا۔ خود تشریف لائے اور بولے کہ آج جو تقریر آپ کریں گے وہ "توسیعی لیکچر" نہیں ہے۔ وہ قرض ہمارے ذمے ہے۔ اب صورت یہ تھی کہ وہ جتنی بار توسیعی لیکچر کا ذکر کرتے تھے مجھے ایک پریشانی سی ہوتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا مجوزہ توسیعی لیکچر جس کے لیے انھوں

نے خود ہی فرمائش کی تھی اُن کے لیے وبالِ جان بن رہا ہے۔ اور جب میں ملتا ہوں سروری صاحب اسی کا ذکر کر کے خود بھی شرمندہ ہوتے ہیں اور مجھے بھی شرمندہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک آدھ بار ایسا ہوا کہ میں جواہر نگر میں اُن کے مکان کے آگے سے گزر گیا لیکن اندر نہ گیا کہ کہیں وہ توسیعی لیکچر کا ذکر نہ کریں۔

اسی دوران میں اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے جموں یونی ورسٹی کی طرف سے اقبالؔ پر توسیعی لیکچروں کا دعوت نامہ ملا۔ سروری صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو نہایت معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگے کہ جموں یونی ورسٹی کشمیر یونی ورسٹی پر بازی لے گئی۔ بہر طور اب سردیوں کے بعد یونی ورسٹی کھلے گی تو ہم لوگ اپنا وعدہ ایفا کریں گے۔ آزاد صاحب! حقیقت تو یہ ہے کہ اب تو آپ کے سامنے آتے ہوئے جھینپ سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اب تو جی یہ چاہتا ہے کہ آپ کے لیکچر کی تاریخ مقرر ہو جائے تو دعوت نامہ لے کر آپ سے ملوں۔ میں نے فوراً ہی موضوع بدل لیا اور کہا سروری صاحب! لیکچر تو ہوتا ہی رہے گا۔ موسم بدلے گا تو پہلی بات یہ کریں گے کہ پیر غیاث الدین کی ہمرہی میں پرنگ جائیں گے۔ معلوم نہیں آپ نے یہ وادی دیکھی ہے یا نہیں۔ سروری صاحب کہتے ہیں کہ کشمیر کی وادیوں میں وادیِ سندھ سب سے زیادہ خوب صورت ہے اور میں اس معاملے میں اُن کا ہم خیال ہوں۔ بولے آپ بات ٹال رہے ہیں۔ لیکن میں اپنا وعدہ نہیں بھولا ہوں۔ حیدر آباد سے آؤں تو پہلے آپ کو دعوت نامہ بھجواؤں پھر کوئی اور بات کروں۔ مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں اور جب وہ حیدر آباد سے آئیں گے تو میری نگاہیں انھیں ڈھونڈتی رہ جائیں گی۔

میں ہنس پڑا اور بولا سروری صاحب! اب کوئی اور بات کیجیے اس بات سے تو اب مجھے EMBARRASMENT ہونے لگی ہے اچانک میں نے ان سے پوچھا EMBARR-ASMENT کو اردو میں کیا کہیں گے۔ بولے "الجھن" اور مجھے یاد آیا کہ ایک بار نہیں بات چیت کے دوران میں کئی موقعوں پر جب میں انگریزی کے مترادف الفاظ کی تلاش میں اٹکا تو سروری صاحب نے فوراً اردو کا موزوں ترین لفظ بتا کر میری مشکل حل کر دی۔ قریب قریب ہم معنی الفاظ میں جو ذرا سا نازک فرق ہوتا ہے اس پر سروری صاحب کی گہری نظر تھی۔ ایک بار اپنے دفتر میں IRRIGATION کی جگہ میں نے آبپاشی کا لفظ استعمال کیا۔ سروری صاحب بولے آب رسانی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ سروری صاحب نے کہیں زیادہ موزوں لفظ

استعمال کیا ہے۔

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ آج کل نئے ادیب "دوران" کے بعد "میں" استعمال نہیں کرتے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ بولے پرانے تمام اساتذہ "دوران" کے بعد "میں" استعمال کرتے تھے۔ نہ جانے "میں" نہ استعمال کرنے کی بدعت کیسے شروع ہوئی۔ پھر کہنے لگے ممکن ہے کبھی میرے قلم سے بھی "دوران" کے بعد "میں" رہ گیا ہو لیکن یہ سہو ہے۔ "دوران" کے بعد "میں" کا ہونا ضروری ہے۔ میں چونکہ "دوران" کے بعد "میں" لکھنا ضروری سمجھتا ہوں اردو میں بھی اور فارسی میں بھی (یعنی بدوران) اس لیے مجھے سروری صاحب کے اس جواب سے یک گونہ اطمینان ہوا۔

ایک بار انھوں نے جموں سے مجھے کسی آنے جانے والے کے ہاتھ خط بھیجا جو مجھ تک پہنچا ہی نہیں۔ چند روز کے بعد آپ سری نگر آئے تو میرے دفتر میں تشریف لائے اور بولے آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ میں منتظر رہا۔ میں نے عرض کیا مجھے تو آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ بولے فلاں صاحب کے ہاتھ بھیجا تھا۔ میں نے کہا وہ صاحب تو مجھ سے ملے نہیں لیکن یہ مجھے پتہ چلا ہے کہ سری نگر آ کے وہ یہیں چلے گئے ہیں۔ فوراً بولے ؎

تیز پر جان کے خط باندھ دیا تھا ہم نے
وہ تو کم بخت گرہ باز کبوتر نکلا

میں گرہ باز کی ترکیب سے آشنا نہیں تھا۔ بولا میں دوسرا مصرع نہیں سمجھا۔ انھوں نے گرہ باز کبوتر کی تشریح کی اور مجھے محسوس ہوا کہ سروری صاحب شعر کے مناسب استعمال پر کس قدر قدرت رکھتے ہیں۔

ان کے گھر جب بھی میں گیا انھیں مطالعۂ کتب یا کچھ لکھنے میں مصروف پایا۔ تصنع اور بناوٹ کے نام سے تو وہ آشنا ہی نہ تھے۔ ڈرائنگ روم ہی ان کے لکھنے پڑھنے کا کمرہ تھا اور اس میں رکھی ہوئی ہر کرسی پر کتابوں اور رسائل کا ایک انبار رہتا تھا۔ یہی حالت میز کی تھی۔ کاغذوں اور مسودوں سے اٹی ہوئی۔ ایک بار کرنل بشیر حسین زیدی سری نگر تشریف لائے۔ غالباً وہ دیال کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے آئے تھے۔ میں ان سے ملنے گیسٹ ہاؤس گیا۔ بولے سروری صاحب سے ملنا ہے۔ چنانچہ میں انھیں لے کر سروری صاحب کے وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو کرسیوں اور صوفے پر کتابوں کے انبار لگے نظر آئے۔ سروری صاحب اوپر کے کمرے میں تھے۔ اب میں حیران تھا کہ زیدی صاحب کو بٹھاؤں تو کہاں۔ ایک کرسی سے کتابیں اور مسودے اٹھاؤں تو انھیں رکھوں

کہاں۔ اتنے میں سروری صاحب آ گئے۔ نہایت بے تکلفی سے دو کرسیوں سے کتابوں کے انبار اٹھا کر زمین پر رکھ دیئے اور بولے بیٹھئے۔ اپنے لیے اندر سے ایک چھوٹی سی کرسی منگوائی اور باتیں شروع ہو گئیں۔ غالب صدی کی تقریبات کا زمانہ تھا اور یہی کرنل زیدی کی ان سے عاوجہ ملاقات تھی سروری صاحب نے ایک چھوٹا سا بکس کھولا جس میں غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نادر تحریریں تھیں۔ غالباً ان میں سے بعض تحریریں بعد میں غالب نمائش میں بھی رکھی گئیں۔

شگفتہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ بات بات میں موقع و محل کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی پھلجھڑی چھوڑ دیتے تھے خواہ وہ لطیفے کی صورت میں ہو، خواہ شعر کی صورت میں۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ کے بعد اردو ادب کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوئے تو تھوڑی ہی مدت میں تین ضخیم جلدیں مرتب کر ڈالیں۔

اردو مثنوی، جدید شاعری، اردو افسانہ اور اردو کی ادبی تاریخ کو اس زمانے میں اپنا موضوع بنایا، جب ان موضوعات پر لکھنے والے بہت کم تھے۔ زبان اور علم زبان پر سب سے پہلے غالباً آپ ہی نے قلم اٹھایا۔

جب انھوں نے اپنی کتاب "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" مجھے عنایت کی تو میں نے کہا سروری صاحب اس کتاب کا عنوان رباعی کا مصرع ہے' بولے جب تک میں تحقیق نہ کر لوں نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا، میں بحر اور وزن کے بارے میں زیادہ واقفیت تو نہیں رکھتا لیکن موزوں اور ناموزوں کا فرق جانتا ہوں، اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" رباعی ہی کا مصرع ہے۔ لیکن سروری صاحب کو اس میں شک ہی رہا۔ کچھ مدت کے بعد ملے تو کہنے لگے کہ فلاں صاحب بھی کہتے ہیں کہ یہ رباعی کا مصرع ہے، لیکن مجھے ابھی تک اس میں شک ہے۔ اصل میں یہ ان کی محتاط مزاجی تھی۔ چونکہ رباعی کے اوزان بحر ہزج کے کم از کم چوبیس زحافات میں ہیں اس لیے انھیں رباعی کے وزن کے بارے میں میری بات فوراً مان لینے میں تامل تھا۔ اب فن کے بارے میں اس قدر احتیاط سے کام لینے والے کہاں باقی رہ گئے ہیں۔

اسی طرح سروری صاحب کی رفاقت میں ربع صدی کا عرصہ گزر گیا۔ وہ جب تک ساتھ رہے مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ یہ علمی، ادبی، سماجی اور ذاتی سرمایہ بنک میں محفوظ ہے، جب جی چاہے گا استعمال کر لیں گے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ سارا سرمایہ اچانک لٹ گیا ہو۔

ابھی اگلے دن میں اقبال اور دانتے کے عنوان سے اپنے مقالے کی تکمیل میں مصروف تھا۔ دانتے کے یہاں SHE-WOEF کا لفظ آیا ہے۔ مجھے اس کا اردو مترادف نہ مل سکا سوچا سروری صاحب سے پوچھ لوں۔ ہاتھ بے اختیار ٹیلی فون کی طرف گیا لیکن اچانک احساس میں وہی آواز گونج گئی۔ سروری صاحب کا کل رات انتقال ہوگیا۔ آپ کو معلوم ہے — اور میرا یہ خواب چشم زدن میں ٹوٹ گیا۔ ربع صدی کے مراسم ایک بار پکچر فلم کی طرح میری نظر کے سامنے آنے جانے لگے اور میر کا یہ مصرع میری زبان پر آگیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مہندر ناتھ

مہندر ناتھ کا خیال آتا ہے تو یادوں کے کارواں حال سے ماضی کی طرف چلنا شروع کر دیتے ہیں اور سینتیس برس پہلے کے لاہور میں جا پہنچتے ہیں جبکہ کرشن چندر اور مہندر ناتھ کے مکان کے قریب ہی میں موہنی روڈ پر واقع موہنی ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔

کرشن چندر اور مہندر ناتھ سے ابھی تک میری سرسری ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر "ادبی دنیا" کے دفتر میں۔ ایک دن صبح صبح کرشن چندر سے ملاقات کے اشتیاق میں ان کے گھر جا پہنچا دروازے پر دستک دی۔ مہندر ناتھ نے دروازہ کھولا اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر بیٹھک میں بٹھا دیا مجھے اب یاد نہیں کہ باتیں کیا ہوئیں لیکن بات چیت میں کوئی انجانے پن یا تکلف کا انداز نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں میں نے کرشن جی کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے وہ اندر ہیں، ابھی آتے ہیں۔ کرشن جی آئے اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اس زمانے میں میراجی اور ن۔م۔ راشد کی شاعری کا بول بالا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میری ان کی بات چیت زیادہ تر انہی کی شاعری کے بارے میں ہوئی کرشن جی اور میرے اندازِ فکر میں بعد المشرقین تھا۔ بات کرنے کا سلیقہ تو مجھے آتا نہیں تھا میں کلاسیکی شاعری کی اہمیت پر زور دیتا تھا لیکن میرے پاس دلائل نہیں تھے۔ کرشن جی جدید شاعری کے بارے میں اپنے نظریات دلائل کے ساتھ بیان کر رہے تھے۔ مہندر نے مہمان کو سبکی سے بچانے کے لیے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ بات ختم ہو گئی۔

اس کے بعد مدت تک کرشن جی سے ملنے کا مجھے حوصلہ نہ ہوا لیکن مہندر ناتھ سے میری دوستی

بڑھتی گئی۔

مجھے یاد نہیں کہ مہندر ناتھ نے لاہور کب چھوڑا۔ لیکن جب ہمارے گھر کے لوگ تقسیم ہند کے بعد دہلی آئے اور رحیم پل بنگش کے ایک مکان میں فروکش ہوئے تو مہندر ناتھ کے ساتھ ان کے بلیو روڈ والے مکان میں ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ کرشن جی شاید اس وقت تک دہلی چھوڑ کے بمبئی جا چکے تھے۔ وہ جب بھی بمبئی سے آتے تھے تو اسی بلیو روڈ والے مکان میں قیام کرتے تھے۔ سرلا بھی وہیں تھیں اور ان کی والدہ محترمہ بھی۔

اس زمانے میں مجھے اس گھر کی جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کرشن جی اور مہندر ناتھ کی باہمی محبت تھی۔ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

ہاں تو میں مہندر ناتھ کی بات کر رہا تھا۔ مہندر کی افسانہ نگاری کی ابتدا تھی۔ پنڈت ہری چند اختر کو مہندر کے افسانے بالکل پسند نہیں آتے تھے لیکن وہ اس کے افسانے پڑھتے تھے۔ "آج کل" کے دفتر میں ایک دن اختر صاحب نے میری میز سے مہندر ناتھ کے افسانوں کا مجموعہ اٹھایا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

جب میں نے انھیں کافی دیر تک اس کتاب کے مطالعہ میں دیکھا تو کہا کہ "پنڈت جی! شاید اب آپ کی رائے مہندر کے افسانوں کے بارے میں بدل گئی ہے۔ آپ بڑے انہماک سے ان کے افسانوں کا مجموعہ پڑھ رہے ہیں۔"

بولے "نہیں" رائے نہیں بدلی، چونکہ تم اس کے افسانوں کی تعریف کرتے ہو اس لیے میں اس کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں کہ شاید تمھاری رائے کی تصدیق ہو سکے۔"

میں نے کہا کہ پنڈت جی! آپ اپنی رائے وضاحت سے بیان کیجیے۔ پنڈت جی نے فنِ افسانہ نگاری پر اظہار نقد کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نگاہ سے مہندر ناتھ کے افسانوں کے معائب گنوانا شروع کیے۔ آخر میں نے رائے دی کہ آپ اس موضوع پر مہندر ناتھ کے ساتھ بات کیجیے تو انھوں نے کہا آج کل کون اپنے فن پر تنقید سننا گوارا کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ اور مہندر ناتھ کے درمیان ایک "میٹنگ" کراؤں گا۔

چنانچہ میرے کمرے (یعنی "بساطِ عالم" کے دفتر) ہی میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ پنڈت جی صاف گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مہندر ناتھ کے ساتھ تقریباً چالیس منٹ ان کی بات چیت ہوئی۔ جو لوگ پنڈت جی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ پنڈت جی "منہ پر کہہ دینے" کے فن میں یدِطولیٰ

رکھتے تھے۔ لیکن اس ساری بات چیت کے دوران میں مہندر ناتھ کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ وہ اختر صاحب کی باتوں سے زیادہ تر غیر متفق اور معمولی حد تک متفق رہے۔

اب مرحوم دوست کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے۔ ملاقاتیں اتنی زیادہ تو نہیں ہوئیں جتنی کہ ایک ہی شہر میں رہنے والے دو دوستوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ کیونکہ مہندر ناتھ بمبئی میں تھے اور میں دہلی میں۔ لیکن یہ ملاقاتیں کم بھی نہیں ہوئیں۔ "شاہراہ" کے دفتر میں یوسف جامعی کے گھر میں، ہمارے گھر میں، مہندر کے گھر میں اور ہر جگہ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ رونق محفل کی حیثیت رکھتا تھا۔

آخری ملاقات کشمیر میں ہوئی۔ لیکن یہ ملاقات کہیں جم کے نہیں ہوئی۔ غالباً فلمز ڈویژن کرشن جی پر ڈاکومنٹری فلم بنا رہا تھا۔ مہندر ناتھ اور سرلا اسی سلسلے میں کرشن جی کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ کرشن جی کے اعزاز میں ایک دعوت تھی۔ اس میں میں بھی مدعو تھا۔ میں ابھی دعوت والے مکان میں پہنچا ہی تھا کہ ایک شخص لپک کر مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ جب میری ہڈی پسلی ٹوٹنے لگی تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ حضرت مہندر ناتھ ہیں۔ میں حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں ڈوب گیا۔

دعوت کے فوراً بعد مہندر ناتھ مجھے نظر نہ آئے۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ ایک اسٹیشن ویگن میں سرلا کے ساتھ بیٹھے ہیں اور ڈرائیور کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ملاقات تو کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ بولے، اب کل فلاں فلاں جگہ جانے کا پروگرام ہے۔ کرشن جی پر ڈاکومنٹری مکمل ہوجائے تو میں سری نگر واپس آؤں گا۔ اس وقت ملیں گے اور گپ شپ رہے گی۔

ڈاکومنٹری کا قافلہ اگلے دن غالباً پونچھ روانہ ہوگیا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب یہ ڈاکومنٹری بننا شروع ہوئی اور کب مکمل ہوئی۔ لیکن خیال تھا کہ شاید ان گرمیوں میں مہندر ناتھ کشمیر آنے کا پروگرام بنائیں۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ میں بھی مہندر ناتھ کا یہ سچا جھوٹا وعدہ بھول گیا اور ایک دن اچانک ریڈیو کی یہ اطلاع میرے کانوں میں پڑی کہ بمبئی میں مہندر ناتھ کا انتقال ہوگیا۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"۔۔۔۔۔ میں اب عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں انسان اپنے دوستوں اور عزیزوں کی موت کی خبریں سننے کا عادی ہو جاتا ہے اور ایسی خبریں اسے ہر وقت ایک ناقابلِ بیان صدمے سے دوچار نہیں کرتیں۔ لیکن مہندر ناتھ کی مرگِ ناگہاں کی خبر سے مجھ پر بجلی سی گری اور بے اختیار میری زبان پر غالب کا یہ مصرع آیا ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

سلیمان اریب

سلیمان اریب کا خیال آتا ہے تو یادوں کے کارواں تصور کی دنیا میں چلتے نظر آتے ہیں۔
ادب میں ترقی پسندی کی جو تحریک ۳۱-۱۹۳۰ء میں شروع ہوئی تقسیم ہند کے وقت اپنے عروج پر تھی۔ ۴۹ء یا ۵۰ء میں مجھے پہلی بار حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس شہر میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے علاوہ جن ناموں سے میں مانوس تھا وہ مخدومؔ اور ادیبؔ تھے۔ زورؔ صاحب اور سروری صاحب سے تو خیر خط و کتابت بھی تھی لیکن مخدومؔ اور ادیبؔ سے تعلق خاطر صرف ان کی شاعری کی بنا پر تھا۔

سفر حیدر آباد کا ایک بڑا مقصد زورؔ صاحب اور سروری صاحب کے علاوہ مخدومؔ اور ادیبؔ سے ملاقات کرنا بھی تھا۔ لیکن جیسا کہ ایک مقالے میں لکھ چکا ہوں وہ زمانہ ہم حکومت کے ملازموں کے لیے بڑا مشکل زمانہ تھا۔ حکومت کی طرف سے ایک حکم جاری ہو چکا تھا جس کی رو سے ہم لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین، انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن اور انڈو سوویٹ فرینڈشپ یونین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انجمن کے مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنے کے باوجود ترقی پسند شاعروں سے ملنا جلنا خلاف مصلحت تھا[1]۔ لیکن اس کے باوجود میری دلی خواہش یہ تھی

---

[1] اس سلسلے میں ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ انہی دنوں میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ گیا۔ قیام سرورؔ صاحب کے ہاں تھا۔ سرورؔ صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے سکریٹری تھے۔
(باقی صـ ۱۱۵ پر دیکھئے)

کہ مخدوم اور اریب سے ملاقات ہو جائے۔ خیال تھا یہ ملاقات زور صاحب کے دولت کدے پر باسانی ہو سکے گی۔ لیکن جب میں حیدرآباد پہنچا تو پتہ چلا مخدوم اور اریب دونوں جیل میں ہیں اور میرے دل کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔

لیکن اریب سے ملاقات دہلی میں ہو گئی۔ سال تو مجھے یاد نہیں آرہا اور تقریب بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً ترقی پسند مصنفین کا کوئی جلسہ تھا۔ یونہی کوئی چھوٹا موٹا جلسہ نہیں، بڑا جلسہ تھا۔ اس میں میری شرکت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر شریک ہوتا تو اس وقت تفاصیل بھی حافظے میں ہوتیں۔ یہی میری بڑی بہادری تھی کہ "شاہراہ" کے دفتر میں جا کے باہر سے آنے والے تمام ادیبوں اور شاعروں سے میں مل لیتا تھا۔ سلیمان اریب کی آمد کا مجھے علم تھا۔ "شاہراہ" کے دفتر ہی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی بار ہم ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ لیکن اریب اس طرح ملے جیسے مدت کی دوستی ہو۔ ملاقات مختصر رہی۔ جلسے کا وقت قریب تھا۔ انھیں جلسے میں شریک ہونا تھا اور میں جلسہ گاہ کی طرف جا نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنے سفرِ حیدرآباد کا ذکر کیا۔ انھیں معلوم تھا۔ کہنے لگے میں اس وقت جیل میں تھا۔ میں نے کہا تم تو تھوڑی مدت میں رہا ہو کے آ گئے، میں ایک ایسی جیل میں ہوں جس سے سالہا سال تک رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ زنجیر کڑی ہوتی جائے گی۔ اریب نے کہا اس کا غم نہ کرو۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔

اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا۔ اگرچہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا لیکن ملاقات کئی برس تک نہ ہو سکی۔ اس دوران میں مجھ پر بھی قیامت گزر گئی۔ بعض لوگ اس بات پر ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ میرا تعلق کسی نہ کسی طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ثابت کر کے مجھے حکومت کے زیرِ عتاب لے آئیں۔ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور ۵۵ء میں مجھ پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ میں کسی مشاعرے یا کسی ادبی جلسے میں شرکت نہیں کر سکتا ان میں آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے بھی شامل تھے۔ آخر اس حکم میں لچک یوں پیدا ہوئی کہ

(سلسلہ صہ ۱۱۴)

اور انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ان کے گھر ہی پر منعقد ہوتے تھے۔ اس اجلاس میں لکھنؤ کے تمام نامور ادیب شریک ہوتے تھے۔ میری موجودگی میں بھی ایک جلسہ ہوا لیکن میں اسی گھر میں مقیم ہونے کے باوجود اجلاس سے دور رہا کیوں کہ شریک ہونے والوں میں دو ایک خفیہ پولیس کے افراد بھی ہوتے تھے۔

مئی ۱۹۵۹ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس زمانے کے ضابطے کے مطابق دعوت مجھے براہ راست نہیں بلکہ منسٹری کے ذریعے سے بھیجی گئی۔ منسٹری نے مجھے اطلاع تک نہ دی اور براہ راست جواب دے دیا کہ مشاعرے میں شرکت ممکن نہیں۔ ہوتے ہوتے بات نواب مہدی نواز جنگ مرحوم تک پہنچی۔ انھوں نے ہمارے وزیر متعلقہ کو ایک خط لکھا اور اس بات پر زور دیا کہ حیدر آباد ریڈیو کے مشاعرے میں میری شرکت ضروری ہے۔ اب معاملہ دو وزیروں کے درمیان تھا۔ میری مشکل آسان ہو گئی۔ اس وقت کے پرنسپل انفارمیشن ایک مدراسی بزرگ تھے۔ مزاج ان کا افسرانہ نہیں بلکہ کلرکانہ تھا۔ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ وزیر متعلقہ نے آپ کو حیدر آباد ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کی اجازت دے دی ہے لیکن یہ بھی کہا ہے کہ جو نظم آپ مشاعرے میں پڑھیں گے وہ بہ نظر احتیاط دیکھ لی جائے۔ یہ کہہ کے وہ خود ہی اس مضحکہ خیز فیصلے پر ہنس پڑے اور بولے کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، میں اس قسم کی تمام چیزیں آپ کو بھیجتا ہوں کہ آپ ان کے بارے اپنا مشورہ مجھے دیں۔ اب مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کی نظم دیکھوں حالانکہ میں اردو جانتا بھی نہیں۔ یہ کہہ کے پھر انھوں نے دفتری نظام کے اس پہلو پر قہقہہ لگایا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ آپ کی اکثر نظموں کے ترجمے وزیر متعلقہ کے پاس پہنچے ہیں اور حکومت کا خیال ہے کہ آپ ایک اشتراکی ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ مشاعرے میں آپ بالکل بے ضرر سی نظم پڑھیں۔

میں چار سال تک مشاعروں کی دنیا سے لاتعلق رہا تھا اور مشاعروں کی شرکت کے عوض عدم شرکت میری عادت بن چکی تھی۔ میں نے عرض کیا لیکن مجھے اس مشاعرے میں شرکت کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ انھوں نے پھر مجھے بزرگانہ انداز میں سمجھایا کہ نواب مہدی نواز جنگ کا خط آنے پر وزیر متعلقہ نے اپنے چار سالہ پرانے فیصلے میں ترمیم کی ہے۔ اب اگر آپ مشاعرے میں شرکت سے انکار کریں گے تو اس کا خراب نتیجہ نکلے گا۔ وزیر متعلقہ کو یہ بات ناگوار گزرے گی اور صورت حال بد سے بدتر ہو جائے گی جس کا آپ کے کیریر پر اثر پڑے گا۔

میں "بہتر جناب" کہہ کے وہاں سے آ تو گیا لیکن مشاعرے میں اس طرح کی شرکت جیسے کسی زندان سے پیرول پر رہا کیا جائے، مجھے پسند نہ تھی۔ میں اسی تذبذب کے عالم میں تھا کہ حیدر آباد سے سلیمان اریب کا خط ملا۔ انھیں صورتِ حال کا تھوڑا بہت علم ہو چکا تھا۔ مجھے انھوں نے لکھا کہ مشاعرہ تو ایک بہانہ ہے۔ اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔ سکندر علی وجد

آرہے ہیں۔ جذبی آرہے ہیں، تم بھی آجاؤ۔ چنانچہ میں رخت سفر باندھ کے حیدرآباد روانہ ہوگیا۔ ۱۹۵۹ء تک اریب کے تئیں غالباً حکومت کا رویہ بدل چکا تھا یا شاید انجمن ترقی پسند مصنفین سے پابندی اٹھ چکی تھی۔ اور اب ان سے ملاقاتیں میرے لیے کسی خطرے کا پیش خیمہ نہیں تھیں لیکن مخدوم ابھی تک حکومت کے معتوب تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ مشاعرے میں شریک بھی نہیں تھے۔ اب اتنا تو مجھے یاد نہیں کہ وہ جیل میں تھے یا جیل سے باہر تھے لیکن اتنا خیال ہے کہ ریڈیو کے دروازے ان پر بند تھے۔ ہاں اریب پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔

قیام اگرچہ اب بھی میراز ور صاحب کے یہاں رہا لیکن اس سفر میں خاصا وقت اریب ہی کے ساتھ بسر ہوا اور مجھے پہلی بار اس کا احساس ہوا کہ اریب ایک اچھا شاعر ہی نہیں ایک پیارا انسان اور محبت کرنے والا دوست بھی ہے۔ ایک ایسا دوست جس کی دوستی صرف خط و کتابت ہی تک محدود نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی کار فرما ہے۔

اب کے میں نے اریب کی معیت میں حیدرآباد کی خاصی سیر کی۔ اکثر ہم عصروں سے اریب نے ملوایا۔ ایک ہوٹل میں جس کا نام اب مجھے یاد نہیں آرہا۔ اریب ہی کی بدولت خورشید احمد جامی سے میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ اس سفر میں میں نے محسوس کیا کہ اریب ام الخبائث کی جانب کچھ زیادہ ہی مائل ہیں۔ میں ۱۹۴۸ء تک، جوش صاحب کی رفاقت میں آنے سے قبل اس شے سے نا آشنا تھا۔ لیکن اس رفاقت کے بعد بھی ام الخبائث کے دام میں بہت زیادہ گرفتار ہونے کی نوبت نہ آئی۔ اریب سے میں نے صاف لفظوں میں کہا کہ تمھاری یہ بات مجھے پسند نہیں۔ بولے تمھاری زندگی میں ایک ضابطہ ہے، توازن ہے۔ ایک طے شدہ پروگرام ہے۔ یہاں کچھ بھروسہ نہیں، کب حکومت گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے۔ کوئی طے شدہ پروگرام نہیں۔ "چراغ" بند ہوگیا۔ اب "صبا" نکال رہا ہوں۔ آمدنی سے خرچ زیادہ ہے۔ یہ تمام پریشانیاں "اسی" سے دور ہوجاتی ہیں۔ اس اتنے بڑے سہارے کو کیسے چھوڑ دوں۔ اریب کی یہ منطق میرے دل کو نہ لگی لیکن میں نے اس بات کو موضوع بحث نہ بنایا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے حیدرآباد ہی میں راجہ دھن راج گیر کے یہاں دعوت تھی۔ سن مجھے پھر یاد نہیں رہا۔ لیکن یہ بھی ایک مشاعرے ہی کا موقع تھا۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ پاکستان سے قتیل شفائی آئے تھے اور اورینٹ ہوٹل (؟) میں ٹھہرے تھے۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ مشاعرہ کسی لان میں نہیں بلکہ ایک ہال میں منعقد ہوا تھا۔ صدارت ڈاکٹر گوپال ریڈی نے کی تھی اور اناؤنسر

کے فرائض پروفیسر عبدالقادر سروری نے انجام دیئے تھے۔ خاصا پھیپھسا ناؤ نوش تھا
مذکورہ دعوت میں فراق گورکھپوری، مخدوم، سلیمان اریب، قتیل شفائی اور راقم التحریر موجود
تھے اور ہاں خود راجہ دھن راج گیر بھی تھے۔ اور اندرا دھن راج گیر بھی جن کی حیثیت جان محفل
کی تھی۔ دو ایک اور حضرات بھی تھے جن کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔ غالباً مقصود علی(؟)
صاحب بھی تھے، جو پرنس معظم جاہ کی طرف سے شعراء کے نام ڈنر کی دعوت لے کر آئے تھے۔ اس بزم
ناؤ نوش میں دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں ہو رہی تھیں۔ خدا جانے کیسے اور کس سلسلے میں
علامہ اقبال کی شاعری کا ذکر آ گیا۔ مخدوم نے کہا چھوڑیئے اقبال کا ذکر۔ وہ کوئی شاعر تھوڑے
ہی تھا۔ یہ سن کر میرے چہرے پر انقباض کی کیفیت طاری ہوئی۔ قتیل نے مخدوم کی بات کا
کچھ زیادہ ہی برا مانا اور اس نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔ "کیوں جناب اگر اقبال شاعر نہیں تھا
تو آپ کس کو شاعر مانتے ہیں۔" مخدوم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا میر اور غالب کو۔ وہ عالم
ہی کچھ اور تھا۔ میرے منہ سے نکلا اقبال ان دونوں سے بڑا شاعر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ بھری
محفل میں کسی نے اس بحث کا موضوع بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ اریب نے قتیل اور مجھ
سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم دونوں پنجابی ہو اس لیے اقبال کو شاعر مانتے ہو ورنہ وہ
شاعر و اعر نہیں تھا اور اس کے ساتھ ہی اقبال اور اس کے مذہب کے بارے میں ایک سخت
جملہ کس دیا۔ قتیل اس سخت ریمارک کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے اریب کے لیے بہ ظاہر مزاحیہ
لیکن دراصل اہانت آمیز فقرہ چست کیا۔ اب مخدوم کو خیال آیا کہ موضوع گفتگو بدلنا چاہیے
چنانچہ اس نے قتیل اور اریب دونوں کو روک دیا۔ مخدوم کا احترام ہر شاعر کے دل میں تھا
اور آج بھی ہے۔ قتیل خاموش ہو گئے۔ لیکن اریب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے یہ سب بات
ناگوار گزری ہے۔ ناؤ نوش کے بعد کھانے کی منزل آئی اور میں نے دیکھا کہ اریب نہ قتیل
سے بات کر رہا ہے نہ مجھ سے۔ دوسرے دن پھر اریب سے ملاقات ہوئی۔ ملتے ہی کہنے لگا
رات کو تمہارا رویہ بڑا غیر معقول تھا صوبائی تعصب کی بنا پر تم قتیل کے ساتھی بن گئے۔ میں نے
کہا اریب! کہاں کا صوبہ اور کہاں کا صوبائی تعصب؟ پنجاب کا نام و نشان مٹ گیا اور
تمہاری نظر میں ابھی تک صوبائی تعصب میں اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔ مخدوم نے کہا تھا
اقبال شاعر و اعر نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا اقبال غالب اور میر دونوں سے بڑا شاعر ہے۔
اب اس ماحول کی بات کو اس وقت منطق کی ترازو میں کیوں تولتے ہو۔ بولا لیکن جو کچھ قتیل نے

میرے بارے میں کہا وہ تم نے کیوں کر برداشت کرلیا۔ تم نے اسے ٹوکا کیوں نہیں۔ میں نے کہا قتیلؔ نے وہ جملہ از راہِ مزاح کہا تھا۔ ہاں اس میں تمہاری اہانت کا پہلو ضرور نکلتا تھا لیکن تمہیں یاد ہوگا کہ مخدوم نے موقعے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً بات کا موضوع بدل دیا تھا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے قتیلؔ اورینٹ ہوٹل میں ملے تھے۔ وہ اس بات سے بالکل ہی خالی الذہن تھے تم بھی اسے رات گئی بات گئی سمجھ کے نظر انداز کردو۔ اور شام کو جب ایک چائے کی دعوت میں ہم تمام مہمان اور میزبان شعرا شریک ہوئے تو قتیلؔ اور میرے خلاف اریب کے دل میں ذرا بھی ملال نہ تھا۔ وہ اسی طرح ہم دونوں سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

حیدرآباد کے ایک اور سفر کا ذکر ہے۔ یہ غالباً ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے کا موقع تھا اور شاید یہ ٹرسٹ کا پہلا ہی مشاعرہ تھا۔ دن میں "سیاست" کے دفتر میں مخدوم کے ساتھ ملاقات ہوگئی لیکن اریب کے ساتھ ملاقات مشاعرے میں ہوئی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے عالم میں تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی بھانپ گئے۔ بولے کہاں سے آرہے ہو۔ میں نے کہا نظام کلب سے غلام احمد کے ساتھ تھا۔ وہ سمجھ گئے۔ بولے میرے ساتھ محفل کب ہوگی۔ میں نے کہا کل شام کو۔ میں برادرم شاذؔ احمد صدیقی کے یہاں مقیم ہوں۔ وہیں آؤ۔ وہیں باتیں ہوں گی۔ چنانچہ اریب دوسرے دن آئے۔ صفیہ بھابی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ تھوڑی دیر ہم وہاں بیٹھے۔ میں نے کہا اریب تمہارا دفتر ابھی نہیں دیکھا، کب دیکھیں گے۔ اریب بولے چلو ابھی چلتے ہیں اور ہم تینوں اریب، صفیہ بھابی اور میں، وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹیکسی لی۔ لیکن دفتر جانے کی بجائے اریب نے ٹیکسی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رکوالی۔ بولے ایک ایک پیالی چائے کی اور ہو جائے۔ ریسٹورنٹ کی نشست خاصی لمبی ہوگئی۔ اس میں اریب نے تفصیل کے ساتھ اپنا نیا مکان حاصل کرنے کے مراحل بیان کئے۔ "صبا" کی روداد سنائی اور میں نے محسوس کیا کہ اردو کا ماہنامہ نکالنا اور اسے باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں۔ کس قدر جانفشانی کا کام تھا۔ اور اریب تخلیق فن کے ساتھ ساتھ اس جانفشانی اور جانکاہی میں بھی مصروف تھا۔ اس ملاقات میں پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ محض اریب کا عزم عاشقانہ ہے جو "صبا" کو زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ حالات اردو کے لیے حیدرآباد میں ایسے ہی ناسازگار ہیں جیسے ملک کے دوسرے حصوں میں۔ اریب نے اپنا خون جگر دے کر "صبا" کی آبیاری کی۔ خدا کرے یہ پودا اریب کی یادگار کے

طور پر ہمیشہ زندہ رہے۔

بمبئی کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے۔ سن مجھے پھر یاد نہیں رہا۔ میں دلی سے گیا تھا اور اپنے دوست ظ۔ انصاری کے وہاں مقیم تھا۔ ظ نے بتایا کہ حیدرآباد سے اریب بھی آنے والے ہیں اور یہیں قیام کریں گے۔ غروب کے قریب اریب آ گئے اور طلوع ہونے کے موڈ میں تھے۔ ان کے ہمراہ قاضی سلیم بھی تھے۔ ظ کے وہاں یوں تو جگہ کم تھی لیکن وہ اپنے دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں، ہم تینوں وہیں ایک کمرے میں ڈٹ گئے۔ رات ہوئی تو ظ نے وہیں کمرے کے ایک کونے سے ایک مستطیل سی کوئی چیز اٹھائی۔ وزن اس کا برائے نام تھا۔ اس کا اِدھر سے ایک پیچ کھولا، ایک اُدھر سے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مستطیل سی شے اچھا خاصا پلنگ بن گئی۔ ہلکا اتنا کہ بائیں ہاتھ سے اٹھا لیں۔ یہ عجوبہ وہ روس سے لائے تھے اور اس رات یہ میرے حصے میں آیا۔

ہاں تو اریب نے آتے ہی محفل جمانے کا مطالبہ کیا۔ ظ نے کہا۔ یہ بمبئی ہے۔ پرمٹ میرے پاس نہیں ہے۔ اب کہیں سے کوشش کرتے ہیں۔ اس پر اریب نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنا سوٹ کیس کھول کے اس میں سے وسکی کی دو بوتلیں نکالیں۔ ہم لوگ یہ کرشمہ دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ بمبئی میں ممانعت شراب تھی اور اسٹیشن پر بکس میں شراب لے کر اترنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا تلاشی لی جائے۔ ایک بار ساحر ہوشیارپوری اور میں دونوں اکٹھے بمبئی کے اسٹیشن پر اترے تھے۔ شراب دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھی۔ لیکن ساحر کے بکس کی تلاشی لے لی گئی تھی۔

میں نے کہا ارے ظالم! یہ جرأت رندانہ تو جیل بھجوا سکتی ہے اتنا خطرہ کیوں مول لیتے ہو۔ کہنے لگے جیل جانا یہاں کون نئی بات ہے۔ مجھے اس جواب سے حیرت ہوئی اور ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے میں نے کہا کہ گویا کسی مقصد کے لیے جیل جانے اور شراب کے جرم میں جیل جانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بولے! کیوں باتوں میں وقت ضائع کرتے ہو۔ شام ہو چلی ہے اور مشاعرے کا وقت قریب ہے۔ اس سے پہلے اپنے کام سے نپٹ لیں۔ چنانچہ ہم چاروں اریب، ظ۔ انصاری، قاضی سلیم اور میں

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

کی تفسیر بن گئے۔ اسی دوران میں اریب نے ریل سے اترنے اور پلیٹ فارم سے باہر آنے کی روداد

اس طرح مزے لے لے کے سنائی کہ اس پر ع ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا، کا گماں ہونے لگا لیکن اس کہانی میں خوف کا جو پہلو پنہاں تھا اور جس پر اریب کی نظر نہیں گئی تھی مجھ پر طاری رہا میں دورانِ گفتگو میں جب اپنے خوف کا اظہار کرتا تو ظ میری دفتری زندگی پر کوئی نہ کوئی فقرہ کس دیتا تھا لیکن اس اندازِ فکر کے باوجود میں اور اریب کس قدر قریب تھے۔ اور اس قربت کے باوجود آج اریب کتنی دور چلا گیا ہے۔!

آخری ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ میں عابد علی خاں کی دعوت پر عثمانیہ یونی ورسٹی کی گولڈن جوبلی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ قیام حسب دستور ارشاد صاحب کے یہاں تھا، نشاط افزا میں، دن بھر بارش ہوتی رہی اور میں گھر سے نکل نہ سکا۔ رات کو مشاعرہ بھی طے شدہ پروگرام کے خلاف لان کے عوض نظام کلب کے ہال میں منعقد ہوا۔ بعض مقامی شعراء تو بارش کی وجہ سے شریکِ مشاعرہ ہی نہ ہو سکے۔ اریب سے ملاقات مشاعرے ہی میں ہوئی اور وہاں یہ طے پایا کہ میں کل شام کو 'صبا' کے دفتر میں آؤں گا۔ لیکن اسی شام کو علامہ حیرت بدایونی نے اپنے دولت کدے پر مہمان شعراء کے اعزاز میں چائے کا اہتمام کیا۔ میں اس دعوت میں جانے سے قبل 'صبا' کے دفتر میں گیا۔ اریب وہاں موجود نہیں تھے۔ کیوں کہ میں قبل از وقت وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسی شام مجھے دہلی واپس آنا تھا۔ چنانچہ پرچہ چھوڑ آیا کہ حیرت صاحب کے یہاں سے اٹھوں گا تو آپ کے یہاں سے ہو کے اسٹیشن جاؤں گا۔ لیکن حیرت صاحب کے یہاں چائے کی پر تکلف دعوت کے اندر ایک مشاعرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ جب برآمد ہوا تو دو ڈھائی گھنٹے اسی کی نذر ہو گئے۔ اس دوران میں حسین اریب کا پیغام لے کر پہنچا کہ میں دفتر میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں لیکن اب ریل کا وقت قریب آ چکا تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر چند منٹ بھی رستے میں رکتا ہوں تو ریل نکل جائے گی چنانچہ میں نے حسین سے معذرت چاہی اور کہا ابا سے کہہ دینا ریل کی روانگی میں چند منٹ ہی رہ گئے ہیں۔ ملاقات انشاءاللہ آئندہ سفرِ حیدرآباد میں ہوگی یا خدا نے چاہا تو کشمیر میں لیکن اس سے پہلے کہ اس کی ملاقات کی صورت پیدا ہوتی اریب اُس سفر پر روانہ ہو گئے جس سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔

اریب کے انتقال کی خبر میں نے ، رستمبر کو ریڈیو پر سنی۔ جیسے احساس پر بجلی گر گئی ہو۔ یقین نہ آیا کہ ہنستا بولتا دوست اچانک اس طرح خاموش ہو گیا ہے۔ کئی بار صفیہ بھابی کو تعزیت کا خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن حوصلہ نہ ہوا۔ آخر کوئی پانچ سات ماہ بعد میں نے یہ

منزل طے کی۔ اپنے دلی غم و اندوہ کا ذکر اپنے خط میں نہ کر سکا۔ چند روز بعد ادبی ٹرسٹ کے چوتھے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لیے پھر حیدر آباد جانے کا پروگرام بنا۔ میں نے صفیہ بھابی کو خط لکھا۔ انھوں نے بتایا کہ مشاعرے کے دنوں میں وہ اور حسین بنگلور میں ہوں گے۔ ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں چار دن حیدر آباد میں رہا۔ صفیہ بھابی میری روانگی تک بنگلور سے واپس نہ آئیں۔ میں زبانی تعزیت نہ کر سکا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ بنگلور سے واپس آ بھی جاتیں تو کیا تعزیت کے لیے میں ان کے پاس جا سکتا تھا۔ کیا مجھ میں اتنی ہمت آ سکتی تھی کہ میں ان کے پاس جا کے اریب کا ذکر کر دوں؟

خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس امتحان سے نہیں گزرنا پڑا۔ لیکن اتنی ہی کڑی منزل اس وقت میرے سامنے آئی جب میں ۴ ار مئی کو حیدر آباد پہنچا اور اس شہر کے طول و عرض میں میری نگاہوں نے اریب اور اس کے ساتھ ہی مخدوم اور جامی کو نہ دیکھا۔ نہ "سیاست" کے دفتر میں، نہ نظام کلب میں، نہ اردو ہال میں، نہ مشاعرے میں۔ ان میں کسی کا ٹیلی فون مجھے نہ آیا۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ میں تم سے ملنے آ رہا ہوں، موجود رہنا۔۔۔ اور اس عالمِ تنہائی میں امیر مینائی کا یہ شعر میرے احساس میں پیہم گونجتا رہا ؎

زیست کا لطف تو احباب کے دم تک ہے امیر
بیٹھ جاتا ہے دل احباب کے اٹھ جانے سے

سری نگر

۲۵ جون ۱۹۷۱ء

عرش ملسیانی

عرشؔ ملسیانی کی موت میرے لیے محض ایک دوست کی موت یا ایک رفیق کار کی موت نہیں تھی۔ یہ حادثہ میرے لیے اس سے کہیں زیادہ تھا۔ مدت رفاقت کو دیکھیں تو یہ مدت چالیس سال سے زیادہ تک پہنچتی ہے۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ عرشؔ سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور یہ بھی یاد ہے کہ پہلی ملاقات ہی میں ہم دونوں میں ایک بے تکلفانہ دوستی پیدا ہو گئی تھی۔

یہ بات ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء کی ہے۔ میں تحریکِ ثقافت لاہور میں ملازم تھا مولوی محمد ابراہیم علی چشتی کا پرائیویٹ سکریٹری تھا۔ جنگی مشاعرے زوروں پر تھے۔ امرتسر میں اس وقت کے ڈپٹی کمشنر ای۔ پی فون نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ میں نے اس میں پہلی بار جوشؔ اور جگرؔ کو دیکھا اور عرشؔ ملسیانی کو بھی۔ جوشؔ کو تو میں صرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ جگرؔ صاحب نے مشاعرے میں غزل سنتے ہی میرا دل بڑھایا۔ میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ بولے "سفر میں بڑی ترقی کرو گے آثار پائے جاتے ہیں۔" دوسرے دن میں ان سے ملنے ان کے کمرے میں بھی گیا۔ ہم سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔ عرشؔ سے مشاعرے کے فوراً بعد ہی بے تکلفانہ بات چیت شروع ہو گئی۔ اگلی صبح ناشتے کی میز پر احسان دانش، پرشوتم لال ضیا، عرشؔ اور میں بہت دیر تک گپ شپ میں مصروف رہے۔

عرشؔ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن میں ملازم تھے۔ غالباً ہیڈ کلرک تھے یا سپرنٹنڈنٹ

حفیظ جالندھری سانگ پبلسٹی آرگنائزر تھے (بعد میں ڈائرکٹر سانگ پبلسٹی ہو گئے تھے) عرش نے اس دفتر کے قصے سنا سنا کے ہمیں ہنسایا۔ اس زمانے کی جنگی ایجنسیاں سب اسی طرح کی تھیں خواہ وہ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن ہو، خواہ تحریکِ رفاقت۔ کام وام تو ہوتا نہیں تھا۔ صرف گورنمنٹ کا روپیہ خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈے جاتے تھے۔ عرش نے ہم سب سے کہا کہ آپ لوگ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔ احسان نے صاف انکار کر دیا۔ نظمیں لکھنے کو میرا جی چاہا کہ معاوضہ ملے گا لیکن کبھی لکھ نہ سکا۔ کیونکہ لڑکپن کا زمانہ تھا۔ گاندھی، جواہر لعل نہرو، ابوالکلام آزاد کا مسلک مختلف تھا۔ ان کے مسلک کے خلاف لکھ کر روپیہ کمانے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ اگرچہ ان شعراء کی صف میں آنے کو جی چاہتا تھا جو بالمعاوضہ نظمیں لکھا کرتے تھے لیکن کبھی اس طرح کی شاعری کرنے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔

اس مشاعرے کے بعد عرش دہلی چلے گئے اور میں لاہور واپس آ گیا۔ خط و کتابت ان کے ساتھ کبھی نہ ہوئی لیکن فوراً بعد لائل پور کاٹن ملز میں مشاعرے شروع ہوئے اور سال میں ایک بار ملاقات ہونے لگی۔ لائل پور میں احسان دانش، عرش اور میں بالعموم ایک ہی کمرے میں فروکش ہوتے تھے۔ احسان اور عرش دونوں مجھ سے سینئر تھے لیکن دونوں کے ساتھ میری بے تکلفی تھی۔ اس لیے عمر میں کچھ فرق ہونے کے باوجود خوردی و بزرگی کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی۔

عرش اس زمانے میں مشاعروں پر چھا جایا کرتے تھے۔ یوں تو مشاعروں کے بے تاج بادشاہ حفیظ جالندھری تھے۔ صرف حفیظ جالندھری۔ جگر صاحب کی آواز اس دور میں ترکِ بے نوشی کے باعث زوال پذیر ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی جگر کی شخصیت جگر کی شخصیت تھی اور جگر کی آواز جگر کی آواز تھی۔ تاہم مشاعروں کی دنیا میں ان دونوں کی موجودگی کے باوجود احسان اور عرش اپنی پاٹے دار آواز کی بدولت مشاعروں کے خاص شاعر تھے۔

لائل پور کے ایک مشاعرے کی بات ہے (یہ لائل پور کاٹن ملز کا مشاعرہ نہیں تھا بلکہ وہ مشاعرہ تھا جو ہر سال خواجہ عبدالرحیم آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر لائل پور منعقد کیا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالرحیم ایک عالم شخص تھے اور اس سالانہ مشاعرے کے موقعے پر ایک سیشن نثر کا بھی منعقد ہوتا تھا) مشاعرے سے قبل نثر کے سیشن میں ایک صاحب نے ایک افسانہ پڑھا جس سے کچھ فرقہ واری کی بو آتی تھی۔ اس روش کو وہاں ہر شاعر اور ہر ادیب نے ناپسند کیا۔ حفیظ صاحب نے مشاعرہ شروع ہوتے ہی تقریر میں اس کی طرف اشارہ کیا اور ان خیالات

کی مذمت کی۔ جب عرشؔ کی باری آئی کلام سنانے کی تو ان کی غزل میں ایک شعر تھا:

احباب کی یہ شانِ حریفانہ سلامت
دشمن کو بھی یوں زہر اگلتے نہیں دیکھا

اس پر سامعین نے بے تحاشا داد سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا۔ کیا رواداری کا دور تھا۔ یہ داد کا طوفان سامعین کی اکثریت کے اپنے ہم مذہب کے ان خیالات کی مذمت میں تھا جو وہ اپنے افسانے میں بیان کر چکے تھے۔

اس وقت مجھے ایک اور مشاعرہ یاد آ رہا ہے۔ یہ مشاعرہ شملے میں تھا۔ سن یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ سر سکندر حیات مرحوم جو اس زمانے میں پنجاب کے وزیر اعظم تھے اس مشاعرے میں موجود تھے۔ شاید مہمانِ خصوصی تھے۔ صدارت غلام محمد صاحب فرما رہے تھے۔ (غلام محمد صاحب بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے) عرشؔ نے اپنی باری پر غزل پڑھی۔ اس میں ایک شعر تھا: ؎

دو روزہ عظمت و شوکت پہ پھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

اس شعر پر وہ داد ملی کہ چھتیں اڑ گئیں۔ عرشؔ کو معلوم نہیں تھا کہ عظمت اور شوکت سر سکندر حیات کے فرزندوں کے نام ہیں۔ اور اس بے خبری کے عالم میں انھوں نے سامعین کی فرمائش پر یہ شعر کئی بار پڑھا۔ اب اس کو کیا کہا جائے کہ اس کے چند روز بعد سر سکندر حیات اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

وقت گزرتا گیا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور میں ہجرت کے سیلاب میں بہتا بہاتا لاہور سے دہلی پہنچ گیا۔

لاہور سے دہلی کا سفر نہ جانے کتنے دنوں میں طے ہوا تھا۔ اپنی منزل کا تو مجھے کچھ علم ہی نہیں تھا۔ تین چار دن کے بعد دہلی آ کر جب ریل رکی تو پتہ چلا کہ یہ ریل اب آگے نہیں جائے گی۔ چنانچہ میں خالی ہاتھ خالی دل پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ اور لوگوں سے پتہ پوچھتا منورؔ لکھنوی کے مکان پر جا پہنچا۔ منورؔ صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی نیند آ گئی۔ رات کو منورؔ صاحب آئے تو انھوں نے مجھے جگایا۔ میری روداد سنی۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور دوسرے دن سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

منوّر صاحب کا مکان بلبلی خانہ میں تھا جو مسلم اکثریت کا محلہ تھا۔ اس محلے میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ اطلاع مسلمانوں تک پہنچی کہ لاہور سے ایک شرنارتھی آیا ہے اور منوّر صاحب کے گھر میں مقیم ہے۔ مسلمان اس اطلاع سے بہت گھبرائے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ لاہور سے آنے والا ہندو شرنارتھی محلے کے مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی خرابی پیدا کرے گا۔ چنانچہ انھوں نے منوّر صاحب سے کہا کہ وہ محلے کے امن و امان پر رحم کریں اور اس شرنارتھی کو اپنے گھر سے نکال دیں۔ منوّر صاحب نے اگرچہ میری وکالت کی اور کہا کہ اس شرنارتھی سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن مسلمان ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ منوّر صاحب نے چند روز بعد میرے لیے ایک اور ٹھکانہ ڈھونڈا اور مجھے اس تک ٹھکانے پر پہنچا آئے۔

یہ عرش ملسیانی کا مکان تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو پنڈت ہری چند اختؔر اور عرش لان میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کے دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "آجاؤ ہم تمھارا انتظار ہی کر رہے تھے" میں حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ انھیں مجھے اس کس مپرسی کے عالم میں یہاں دیکھ کر نہ حیرت ہوئی ہے نہ انھوں نے میری روداد سننے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے اس بے تکلفی کے ساتھ انھوں نے مجھ سے آجاؤ کہا ہے جیسے ہندوستان اور پاکستان میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں ان کے قریب پہنچا تو عرؔش نے کہا بیٹھو اور پھر دونوں تاش میں مگن ہو گئے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا آپ دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ مجھ سے پوچھتے کیوں نہیں کہ میں یہاں کب آیا۔ کب لاہور سے چلا، لاہور اور امرتسر میں انسانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ اختؔر کہنے لگے، ہمیں سب معلوم ہے۔ تم ہاتھ منہ دھو لو اور چائے پیو اور پھر دونوں تاش میں محو ہو گئے۔

قتل و غارت کے واقعات کی خبریں سننا روز کا معمول بن گیا تھا۔ لاکھوں افراد لٹ لٹا کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ رہے تھے۔ میرے لاہور سے چلے آنے پر کوئی کیوں حیرت کا اظہار کرتا۔

اب میرے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک تو یہ کہ والدین اور بچے راولپنڈی سے کیسے دہلی پہنچیں گے۔ دوسرا اپنے روزگار کا مسئلہ۔ اس آخر الذکر مسئلے کے تو حل ہونے میں دیر نہ لگی۔ روزنامہ "ملاپ" میں ملازمت مل گئی۔ یہ صورت حال چند ماہ تک رہی۔ اس کے بعد عرؔش ملسیانی نے مجھ سے منسٹری آف لیبر کے دفتر میں درخواست دلوا دی اور مجھے ایک کام مل گیا۔

عرؔش خود اسی دفتر میں ملازم تھے۔ اُن کی مستقل ملازمت تھی۔ میری عارضی ملازمت تھی۔

عرش خود جو تنخواہ پا رہے تھے۔ اس سے میری ملازمت کی تنخواہ زیادہ تھی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر عرش کی ذاتی مدد شامل نہ ہوتی تو شاید مجھے یہ ملازمت نہ ملتی۔

منسٹری آف لیبر میں کام کرتے ہوئے مجھے ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ پبلیکیشنز ڈویژن کے نائب مدیروں کی تین اسامیاں خالی ہوئیں۔ مدیر کی تنخواہ تو اتنی زیادہ تھی کہ درخواست دینے کا مجھے حوصلہ ہی نہ ہوا۔ نائب مدیر کی جگہ کے لیے میں نے درخواست دے دی۔ کچھ مدت بعد انٹرویو ہوا۔ اور عرش ملسیانی، میں اور بلونت سنگھ ان اسامیوں کے لیے منتخب ہو گئے چند روز بعد مدیر کا انتخاب عمل میں آیا اور اس عہدے پر حضرت جوش ملیح آبادی کا تقرر ہوا۔

پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبۂ اردو میں تین ماہانہ جریدے تھے: "آج کل"، "بساط عالم" اور "نونہال"۔ تقسیم کار کا سوال پیدا ہوا تو "آج کل" کا کام عرش ملسیانی کے سپرد ہوا۔ "بساط عالم" میرے حصے میں آیا۔ اور "نونہال" بلونت سنگھ کے حوالے ہوا۔ کچھ مدت بعد پنڈت ہری چند اختر بھی اسی زمرے میں آ کر شریک ہوئے۔ ایک پندرہ روزہ جریدے کا اضافہ ہوا اور اس کی ادارت اختر صاحب کے سپرد ہوئی۔

اب عرش اور میں ایک ہی دفتر میں رفیقِ کار تھے۔ ہر روز کا بلکہ ہر وقت کا ملنا تھا۔ دفتر میں کام علمی اور ادبی نوعیت کا تھا۔ چونکہ اپنے مذاق کا کام تھا اس لیے بہت کم وقت میں مکمل ہو جاتا تھا اور زیادہ تر وقت ہم لوگوں کا ادبی گپ شپ میں صرف ہوتا تھا۔ یہ گپ شپ اکثر و بیشتر جوش صاحب کے کمرے میں رہتی تھی اور کبھی کبھار عرش کے کمرے میں یا میرے کمرے میں بھی۔ میرے اور عرش کے چھوٹے چھوٹے کیبن تھے۔ جوش کا کمرہ صحیح معنی میں ایک کمرہ تھا۔ جب اسی اولڈ سکریٹریٹ میں ۱۹۳۰ء سے قبل مرکزی حکومت کے صدر دفاتر تھے تو اسی کمرے کے عین مقابل اور اسی وضع قطع کا کمرہ ہندوستان کے کمانڈر انچیف کا کمرہ تھا۔ جوش والے کمرے میں بھی قریب قریب اسی حیثیت کا کوئی افسر بیٹھتا ہوگا۔

اس دفتر میں عرش ملسیانی نے اور میں نے آٹھ برس اکٹھے بسر کیے۔ عرش دفتری طور طریقوں سے آشنا تھے۔ میں صرف یہی نہیں کہ ان طور طریقوں سے آشنا نہیں تھا بلکہ میں ان طریقوں سے بیزار بھی تھا۔ دفتری ریڈ ٹیپ ازم اور دفتری طور طریقوں کے ساتھ میری کسی حد تک دلبستگی بہت بعد میں آ کے شروع ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں، جب کہ میں سری نگر میں پریس انفارمیشن بیورو کا ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر مقرر ہوا اور عملی طور پر تعلقات عامہ کے سلسلے میں کام کرنے کی ایک

طرح سے آزادی بھی حاصل ہوئی اور اختیارات بھی ملے۔ اس سے قبل تو بیزاری ہی بیزاری تھی اور میں اس بیزاری کے عالم میں اکثر ان افسروں کو ناراض کر دیتا تھا جن کے ہاتھ میں ایڈمنسٹریشن کی باگ ڈور ہوتی تھی اور جن کی بدولت ہمارے روزمرہ کے مسائل حل ہو سکتے تھے مثلاً اسٹیشنری کا حصول، ٹی اے اور ڈی اے کا وقت پر حصول، چپراسی ملنے کی آسانی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے موقعوں پر عرش مجھے اکثر سمجھایا کرتے تھے کہ ان لوگوں کے ساتھ ہمیشہ بنا کے رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ ہر قدم پر ہمارے کام میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں اور ہم ان کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ بلکہ ہمیں ان سے اکثر کام پڑتا ہے اور ان کو ہم سے کبھی کام نہیں پڑ سکتا۔

عرش ایک انتہائی ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ میں نے ان کے ساتھ اپنی پبلی کیشنز ڈویژن کے آٹھ برس کی شب و روز کی رفاقت کے دوران میں انھیں کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ کبھی اونچی آواز سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں طنز کا نشتر اکثر چلا دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں جب میں معمولی باتوں پر کسی سپرنٹنڈنٹ سے، کسی سیکشن آفیسر سے کبھی ہیڈ کلرک سے جھگڑ بیٹھتا تھا اور عرش آکر مجھے سمجھاتے تھے کہ ان لوگوں سے جھگڑا کرنے میں اپنا نقصان ہے تو مجھے ان کے پند و نصائح بہت گراں گزرتے تھے، لیکن میں ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اس موضوع پر کبھی ان سے بحث نہیں کرتا تھا اور بڑے صبر و تحمل سے ان کی نصیحت اول سے آخر تک سُن لیا کرتا تھا۔

پبلی کیشنز ڈویژن میں تو عرش کے مشورے اور عرش کی موجودگی کے باعث اکثر وہ حالات جو میں خود ہی بگاڑ لیا کرتا تھا، سدھر جاتے تھے۔ لیکن جب میں پبلی کیشنز ڈویژن سے پریس انفارمیشن بیورو میں گیا تو پتہ چلا کہ یہاں اگر میں نے جھگڑا کر کے حالات میں خرابی پیدا کر دی تو اسے سدھارنے یا سنوارنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ میں نے عرش کی ان نصیحتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا جنھیں میں پہلے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔

عرش کی دوستی کے ایک اور پہلو کا یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۴۸ سے ۵۵ تک کا زمانہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس مدت میں سردار جعفری، ظ انصاری، تاباں اور مجروح سلطان پوری کو کئی بار جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی۔ جعفری جیل سے رہا ہونے کے بعد جب بھی دہلی آتے تھے جوش سے ملنے ضرور آتے تھے۔ ویسے بھی جوش چونکہ خود ترقی پسندوں کے امیرِ کارواں تھے، اس لیے ان کے کمرے میں ترقی پسندوں کا ہر وقت

وقت جمگھٹا رہتا تھا۔ میں اور بلونت سنگھ اگرچہ کھلم کھلا ترقی پسندوں کے ساتھ نہ تھے۔ نہ ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے۔ کیونکہ ہم دونوں حکومت کے ملازم تھے۔ لیکن تھے اسی جماعت کے حامی۔ وہ اس لیے کہ اس جماعت کے باہر تو چاروں طرف فرقہ پرستی ہی فرقہ پرستی نظر آتی تھی۔ عرش خدا جانے واقعی یا مصلحتہً ترقی پسندوں کے خلاف تھے اور بات بات میں اپنی اس مخالفت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ وہ میری نظمیں پڑھتے تھے تو مجھے اکثر مشورہ دیا کرتے تھے کہ سردار پٹیل کا زمانہ ہے تم محتاط ہو کے چلو، ورنہ اگر کسی شکنجے میں پھنس گئے تو چھٹکارا مشکل سے ہو سکے گا۔ اس تمام تر نظریاتی اختلاف کے باوجود میری اور عرش کی دوستی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ آخر میری یہ "بے راہ روی" رنگ لائی اور میرے دو" دوستوں" نے میری نظموں کے انگریزی ترجمے اس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر بی۔وی کیسکر اور سکریٹری وزارت اطلاعات و نشریات پی۔ایم لاؤ کے سامنے جا کے رکھ دیئے۔ میں زد میں آگیا اور اس کے بعد میری زندگی کے تین چار سال جس عذاب میں گزرے وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ یہاں اپنے اس عذاب کی تفصیل بیان کرنا بے کار ہے لیکن یہ بتانا نہایت ضروری ہے کہ میرے خیالات سے متفق نہ ہونے کے باوجود عرش نے اس معاملے میں مجھے ہمیشہ اچھے سے اچھا مشورہ دیا اور میں اپنے صفائی کے بیانات میں اگر کہیں کمزوری دکھاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ تمھارے عقیدے میں فرق نہیں آیا تو یہ کمزوری نہ دکھاؤ۔ پی۔ایم لاؤ اور ڈاکٹر کیسکر سے اوپر بھی ایک سطح ہے اور وہ جواہر لال نہرو کی سطح ہے۔ تم اپنے بیان میں کمزوری نہ دکھاؤ بلکہ اپنے بیان کی ایک نقل جواہر لال نہرو کو بھجوا دو اور اس طرح سے کہ ان تک پہنچ جائے۔ تمھارے مخالفوں کی ریشہ دوانیاں جواہر لال نہرو کی سطح پر پہنچ کر بے اثر ہو جائیں گی۔

۱۹۵۵ء میں جوش پاکستان چلے گئے۔ میں ان کی اس نقل مکانی سے قبل ہی پریس انفارمیشن بیورو کے اردو سیکشن میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہو کے دلی کمشنز ڈویژن سے جا چکا تھا۔ جوش کے جانے پر عرش "آج کل" کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد عرش سے میری روزانہ کی ملاقات تو ختم ہو گئی لیکن مہینے میں چار یا پانچ بار میں دہلی کمشنز ڈویژن میں آ کر اور ان سے مل کر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر لیا کرتا تھا۔ کچھ مدت بعد عرش ملازمت سے سبکدوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ ان کا مکان ماڈل ٹاؤن میں تھا۔ میں اس زمانے میں نئی دہلی کی ایک کالونی ونے مارگ (ڈپلومیٹک انکلیو) میں مقیم ہو چکا تھا۔ دونوں کالونیوں میں کوئی سولہ سترہ میل کا فاصلہ تھا چنانچہ ہماری ملاقاتیں اس زمانے میں ٹیلی فون کی ملاقاتوں میں تبدیل ہو کے رہ گئیں۔

۱۹۶۸ء میں بسلسلۂ ملازمت میں سری نگر آ گیا۔ ۱۹۶۸ء سے لے کے ۱۹۷۵ء تک عرشؔ کے ساتھ میری بھرپور خط و کتابت رہی۔ اِس وقت عرشؔ کے متعدد خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، جو ہر اعتبار سے علمی اور ادبی دستاویزیں ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اگر کبھی فرصت ملے تو اِن خطوط کو مرتب کر کے میں عرشؔ کی تصویر ان کے خطوط کے آئینے میں پیش کروں۔

۱۹۷۵ء میں عرشؔ کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی۔ میرا دہلی تو اکثر جانا ہوتا تھا لیکن اتنے کم وقت کے لیے کہ عرشؔ سے ملاقاتوں کا سلسلہ قریب قریب ٹوٹ ہی گیا۔ لیکن اس کے باوجود میں کبھی کبھار ان سے ملنے ماڈل ٹاؤن پہنچ جایا کرتا تھا۔ آخری بار میں ان کے انتقال سے کوئی ایک برس قبل اُن کے مکان پر ان سے ملا۔ بیمار تھے۔ دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ جوشؔ ملیح آبادی کے زمانے کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں کوئی دو گھنٹے وہاں رہا۔ اٹھنے لگا تو بولے "رکو، میں بھی چلتا ہوں مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے" وہ لاٹھی کے سہارے سے اٹھے تو مجھے اُن کی علالت کی شدت کا پتہ چلا۔ اُن کے لیے چلنا دشوار تھا اور ان کا ایک پڑوسی انھیں سہارا دے کر ڈاکٹر کی دکان یا ڈسپنسری تک لے جایا کرتا تھا۔ عرشؔ اٹھے تو وہ صاحب بھی آ گئے اور انھیں سہارا دے کر ڈاکٹر کی دکان تک لے گئے۔ ڈاکٹر کی دکان بہت قریب تھی۔

اس کے بعد آخری ملاقات ہوئی اور وہ ان کے انتقال سے کچھ قبل ولنگڈن نرسنگ ہوم میں۔ میں جب اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے اپنا نام اونچی آواز میں بتایا۔ نام سنتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ یہ وہی عرشؔ تھے جو اپنی باتوں اور لطیفوں سے ہر محفل کو قہقہہ زار بنا دیا کرتے تھے۔ آج انتہائی بے بسی کے عالم میں زار زار رو رہے تھے۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ سو گئے اور میں اُن کی اہلیہ سے اجازت لے کے وہاں سے چلا آیا۔ نرسنگ ہوم سے باہر نکلا تو میری زبان پر یہ اشعار تھے۔

"آج کل" کا وہ زمانہ ہے ابھی یاد مجھے ۔۔۔ آج جس کی سحر و شام پہ رونا آیا
ہم کو یہ گردشِ ایام کہاں لے آئی ۔۔۔ کہ مجھے گردشِ ایام پہ رونا آیا
عرشؔ کو موت کے بستر پہ جو دیکھا ہے تو آج ۔۔۔ زندگانی! ترے انجام پہ رونا آیا
آدمی جس ہوسِ خام میں رہتا ہے اسیر ۔۔۔ مجھ کو آج اس ہوسِ خام پہ رونا آیا

اِس کے بعد میں عرشؔ کو اس عالم میں دیکھنے کا حوصلہ نہ کر سکا اور کچھ مدت بعد آل انڈیا ریڈیو کی یہ آواز میرے کان میں آئی کہ عرشؔ ملسیانی ایک طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں ——
ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

محمد دین تاثیر

کیا ہنس مکھ چہرہ تھا!

اس ہنس مکھ چہرے سے میری پہلی ملاقات آج سے بارہ برس قبل ہوئی۔ جب میں ایم۔اے میں داخل ہونے کے لیے راولپنڈی سے لاہور آیا۔ گورنمنٹ کالج میں ایک مشاعرہ تھا، پروفیسر بشیر احمد ہاشمی کی زیرِ صدارت۔ اس میں ڈاکٹر تاثیر نے اپنی مشہور نظم "رس بھرے ہونٹ" پڑھی تھی۔ مشاعرے کے بعد غالباً وقار انبالوی کے ذریعے اُن سے تعارف ہوا۔ دو چار منٹ تک باتیں ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ اگر اس عالم فن کار سے میری ملاقات ہوتی رہی تو مجھے بہت کچھ حاصل ہوتا رہے گا۔

لیکن دوسری ملاقات میں خلافِ توقع ایک بڑی طویل مدت حائل ہو گئی۔ اگر ڈاکٹر تاثیر امرت سر میں رہتے تو ملاقات کے کئی مواقع پیدا ہوتے۔ لیکن آپ انھی دنوں دہلی چلے گئے۔

اگلے برس لائل پور میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کا انتظام کچھ تو مقامی انجمن ترقی اردو کے ہاتھ میں تھا جس کے منتظمین خلیق قریشی اور منظور احمد منظور تھے اور کچھ ابو الاثر حفیظ جالندھری کی سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے زیرِ اہتمام۔ دونوں طرف سے دعوت نامے آئے۔ راولپنڈی سے والد محترم کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ہم لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو ڈاکٹر تاثیر اور حفیظ صاحب پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر تاثیر کو ایک برس پہلے کی ملاقات یاد تھی۔ بڑی محبت سے ملے۔ انھوں نے اسٹیشن پر نارنگیاں خریدیں۔ تین چار نارنگیاں اُن کے ہاتھ میں تھیں۔ میں نے اُن کے کہنے پر اُن میں سے ایک اٹھالی۔ کہنے لگے یہ اچھی نہیں ہے۔ یہ دوسری لو۔ میں نے وہ رکھ دی

اور دوسری اٹھالی تو بولے اصل میں یہی خراب تھی۔ میں اچھی نارنگی خود لینا چاہتا تھا۔ اس پر خوب قہقہہ پڑا اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی میرا ہم عمر دوست مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔

والد نے باتوں کے دوران میں تاثیر مرحوم کے بالوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اب تو آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا "جی ہاں" دل کا رنگ بالوں میں آرہا ہے۔" والد نے فوراً سوال کیا "اور بالوں کا رنگ؟" اس پر پھر قہقہے بلند ہوئے اور ان میں بلند ترین قہقہہ ڈاکٹر تاثیر کا تھا۔

ریل چلنے سے پہلے ہم لوگ الگ الگ ڈبوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ انتظام ہی ایسا تھا۔ لائل پور مشاعرے میں پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ آپ والد کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے بہت دیر آپ ان سے باتیں کرتے رہے۔ میں بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ بڑے غور سے یہ باتیں سنتا رہا۔ تاثیر صاحب نے والدِ محترم سے پوچھا "محروم صاحب نئی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

والد:۔ "نئی شاعری سے آپ کیا مراد لے رہے ہیں۔"

تاثیر:۔ آزاد نظم اور نظمِ معرا۔

والد:۔ بحیثیتِ مجموعی مجھے اس طرح کی شاعری پر کوئی اعتراض نہیں۔

تاثیر:۔ کوئی اعتراض نہیں یا یہ شاعری آپ کو پسند ہے۔

والد:۔ اس کا نمونہ تو پسند نہیں۔ ہاں بعض نظمیں ایسی میری نظر سے گزری ہیں۔ جو پسند ہیں۔

تاثیر:۔ مثلاً؟

والد:۔ مثلاً ن۔ م راشد کی بعض نظمیں۔

تاثیر:۔ آپ نے خود بھی کبھی آزاد نظم یا نظم معرا کا تجربہ کیا۔

والد:۔ میں نے خود تو یہ تجربہ نہیں کیا لیکن (میری طرف اشارہ کر کے) اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند۔ اس پر ڈاکٹر تاثیر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے تم تو نظم معرا اور آزاد نظم دونوں کہتے ہو۔ میں نے "ادبی دنیا" میں تمھاری نظمیں پڑھی ہیں۔

میں:۔ مولانا کہتے ہیں تمھاری یہ نظمیں مہمل ہیں اور انھوں نے ایسی نظمیں کہنے سے مجھے روک دیا ہے۔

تاثیر:۔ کون مولانا ؟

میں:۔ میرے استاد تاجور نجیب آبادی۔

تاثیر:۔ لیکن وہ تو آزاد نظم اور نظم معرا کے حق میں ہیں۔ انھوں نے ان دونوں کی حمایت میں مضامین لکھے ہیں۔

میں:۔ لیکن میری نظموں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ مہمل ہیں۔

تاثیر:۔ تو تم مہمل کیوں کہتے ہو ؟

اس پر ہم تینوں اور آس پاس بیٹھے ہوئے تمام شعرا نے جو یہ باتیں غور سے سن رہے تھے ایک قہقہہ لگایا۔ ابھی میں شاعری میں ابہام کے موضوع پر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مشاعرے کے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔

مشاعرہ شروع ہوا اور باری باری شعرا اپنا کلام پڑھنے لگے۔ جب حمید نسیم کی باری آئی تو انھوں نے یہ غزل پڑھی۔

اُسے پیراہنِ تصویر پہناتے رہے ہیں ہم

ایک شعر پر والد نے بہت داد دی۔ تاثیر نے حمید نسیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہ شعر پھر پڑھو۔ اس پر مخدوم خاص طور پر داد دے رہے ہیں۔"

اس کے بعد حلقۂ اربابِ ذوق (لاہور) کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے آپ تشریف لائے امرتسر ہی سے۔ اس اجلاس کے پروگرام میں یوسف ظفر کی نظم تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے پڑھی تھی:

کنارِ آبِ رواں آج بھی وہی ہے سکوت
جسے لکالا تھا شہروں کے شورِ پیہم نے

اس نظم کی بحیثیتِ مجموعی ڈاکٹر تاثیر نے بہت تعریف کی۔ تنقید کے دوران میں ایک ترکیب پر جو مجھے اس وقت یاد نہیں، آپ نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ تو بالکل غیر مانوس ترکیب ہے۔ اس جدت کو نفاست کیسے گوارا کر سکتی ہے ؟ ظفر نے کہا "لیکن میرے کانوں کو تو یہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔" آپ نے کہا کہ "یہی تو میں کہتا ہوں کہ تمھارے کان کھینچنے چاہئیں۔ انھیں کیوں یہ ترکیب بھلی معلوم ہوتی ہے۔" اس پر اجلاس ایک قہقہہ زار بن گیا۔ معلوم نہیں قہقہے کے اس شور میں یوسف ظفر نے کیا جواب دیا۔

تقسیم ہند کے بعد میں دہلی آیا تو آپ دہلی سے لاہور چلے گئے۔ یہاں پچھلے سال میرا پہلا مجموعۂ کلام "بے کراں" چھپا تو اس کی ایک جلد میں نے انھیں بھیجی۔ انھوں نے مجھے خط اور کتاب کی اطلاع دی اور ساتھ ہی کتاب پر اپنی گراں قدر رائے سے بھی نوازا۔ میں ان کی یہ دونوں محبت بھری تحریریں نیچے درج کر رہا ہوں۔

جگن ناتھ آزاد کے مجموعۂ کلام سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت گزری۔ میں نے یہ جانا یہ محسوس کیا کہ جیسے تاریخ کا چکر الٹا گھوم رہا ہے۔ جیسے دنیا ارباب سیاست کے ہاتھوں سے نکل کر اہلِ ادب کے قبضۂ قدرت میں آگئی ہے۔ جیسے انسان بہیمیت بھول گیا ہے۔ انسان بن گیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا کلام غزل، نظم، قطعہ، رباعی ادبیت میں رچا ہوا ہے۔ اس کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، حسرت موہانی، جوش چکبست میں وجہ مشترک ہیں۔ الگ الگ شخصیت اور طرزِ اظہار کے باوجود!

یہ ایک گداز طبیعت، دردمند دل، حساس شخصیت کا کلام ہے۔ ایک محبت کرنے والے عالی ظرف دوست کی گفتار ہے۔ جو بہت سی باتیں چشمِ سخن گو اور جنبشِ ابرو سے کہہ جاتا ہے۔ وہ جسے بلاغت کہا جاتا ہے آزاد کے کلام میں اس کا وفور ہے۔ یعنی دل و دماغ دونوں کا نور ہے۔ اس ہیجانی دور میں ادبی توازن کو برقرار رکھنا بڑی عظمت کی نشانی ہے—

جگن ناتھ آزاد کے کلام میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی۔

تاثیر

اور خط کے جواب میں آپ نے لکھا:

Fairfields Hotel
Murree.

۱۸.۸.۴۹

عزیزِ محترم جگن ناتھ جی۔

تسلیمات۔

آپ کا خط لاہور سے ستھنیا گلی اور وہاں سے مری پہنچا۔

کتاب کچھ دن بعد ملی۔ یعنی پرسوں۔
آپ کا خط، یاد آوری، کلام ...... میں کیا عرض کروں۔ اس عمر
میں بچوں کی طرح رونا چاہا۔
ع ہر لفظ نے تبدیل کیے اپنے معانی
اچھا کبھی انسانیت فتح پائے گی۔

والسّلام

آپ کا مخلص بھائی
تاثیر

آج بھی نگارشات میرے پاس تاثیر کی آخری یادگار ہیں۔
پاکستان بننے کے بعد کا ذکر ہے۔ میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لائل پور گیا
واپسی پر چند لمحوں کے لیے ڈاکٹر تاثیر سے ملاقات کا وقت میں نے نکالا۔ وہ اس وقت اسلامیہ
کالج لاہور میں پرنسپل تھے۔ دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ تپاک سے ملے۔ والد محترم کے متعلق
پوچھا۔ یہ بھی پوچھا کہ کب تک قیام رہے گا۔ اور انھیں یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ میں اسی
وقت دہلی جا رہا ہوں۔ شاید ایک ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ مجھ سے انھوں نے پوچھا کھانا
کھاؤ گے۔ میں نے عرض کیا۔ جی نہیں۔ کھانے پر خلیفہ اقبال حسین میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ان
کے یہاں کھانا کھا کے سیدھا دہلی چلا جاؤں گا
انھوں نے چپراسی کو بلایا اور کھانا لانے کو کہا۔ کھانا سامنے عرب ہوٹل سے منگوایا گیا تھا۔
انھوں نے چپراسی سے کہا دو آدھی آدھی پلیٹیں لاؤ۔ میں نے سمجھا ایک آدھی پلیٹ میرے لیے
ہے۔ میں نے پھر عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب کھانا تو میں یہاں سے جا کے خلیفہ اقبال حسین کے یہاں کھاؤں
گا۔ اس پر انھوں نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ "دوسری پلیٹ بھی میرے لیے ہے۔ تمھارے لیے نہیں ہے"۔
اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آگئی کہ دو آدھی آدھی پلیٹوں کا آرڈر کیوں دیا ہے ـــ
ایک پوری پلیٹ کا آرڈر کیوں نہیں دیا۔
تاثیر صاحب سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اور اس وقت جب کہ میری آنکھوں میں
آنسو ہیں۔ ان کا قہقہہ بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے اور ساتھ ہی یہ الفاظ بھی کہ "دوسری
پلیٹ بھی میرے لیے ہے، تمھارے لیے نہیں ہے"۔

۷ر دسمبر ۱۹۵۰ء

درگا پرسادر دھر

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا !
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

تاریخ اور مہینہ یاد نہیں آرہا لیکن غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ کشمیر کی تقدیر پلٹا کھا چکی تھی، اور شیخ محمد عبداللہ کی زیر قیادت کشمیر میں ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ ریاست کے وزیر اعظم تھے بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم۔ ان دونوں رہنماؤں سے دہلی میں کبھی کبھار ملاقات رہتی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے میں اپنے دفتر پبلی کیشنز ڈویژن میں جوش صاحب کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ انھی کے کمرے میں کہ میرے دوست علی محمد طارق تشریف لائے اور ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے میں شیخ صاحب اور بخشی صاحب کی جانب سے آیا ہوں۔ شیخ صاحب اور بخشی صاحب نے آج رات آپ دونوں کو کھانے کی دعوت دی ہے، کشمیر ہاؤس میں۔ دعوت کا سبب پوچھا تو بولے کہ کشمیر میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرنے کا خیال ہے اس سلسلے میں شیخ صاحب اور بخشی صاحب آپ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں

چنانچہ رات کو ہم لوگ کھانے پر پہنچے۔ اسی دعوت میں ایک مشاعرے کی داغ بیل ڈالی گئی اور چند روز بعد اسی مشاعرے میں شرکت کے لیے میں پہلی بار سری نگر آیا۔

دعوت والی رات ہی میں نے شیخ صاحب سے عرض کیا کہ میں نے ابھی تک کشمیر نہیں دیکھا۔ چاہتا ہوں مشاعرے سے چند روز قبل ہی سری نگر پہنچ جاؤں۔ میری یہ تجویز انھوں نے

قبول کرلی اور میں انعقادِ مشاعرہ سے تین چار روز قبل ہی سری نگر پہنچ گیا۔ اُس وقت اتنا یاد ہے کہ پنڈورنامی ایک ہاؤس بوٹ میں میرا قیام تھا لیکن اب جھیل ڈل میں اس نام کی کوئی ہاؤس بوٹ نظر نہیں آتی۔

باقی شعراء میں جوش، فراق، ساغر، جذبی، روش صدیقی تین چار روز بعد پہنچے اور میں نے یہ تین چار روز پیر غلام رسول نازکی اور طارق صاحب کے ساتھ سیرِ کشمیر میں گزارے۔ نیشنل کانفرنس کی سرگرمیاں اس زمانے میں زوروں پر تھیں اور انھی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک نام خاص طور سے شیخ صاحب، بخشی صاحب، مسعودی صاحب، بیگ صاحب اور صادق صاحب کے ناموں کے ساتھ سننے میں آرہا تھا اور میں جس نام سے اس وقت تک بے خبر تھا۔ یہ نام تھا ڈی۔ پی۔ دھر۔

سری نگر پہنچتے ہی جن حضرات کے ساتھ ابتدائی ملاقاتوں ہی میں بے تکلفی ہوگئی تھی ان میں اکبر لداخی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اکبر لداخی نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے کہا کہ آج تم کو ایک یگانۂ روزگار شخصیت سے ملاتے ہیں۔ یہ کہہ کے انھوں نے ٹیلی فون کا ڈائل گھمانا شروع کیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے پر انھوں نے پوچھا ڈی۔ پی صاحب ہیں؟ جواب غالباً منفی میں ملا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پھر ٹیلی فون کیا۔ جواب اب کے پھر منفی میں ملا تو میں نے پوچھا بھئی اکبر یہ ڈی۔ پی صاحب کون ہیں، میں جب سے آیا ہوں ان کا نام سن رہا ہوں۔ لیکن کبھی ان کی زیارت کا موقع نہیں ملا۔ مشاعرہ بھی ہوگیا۔ دو تین جگہوں پر کھانے کی دعوتیں بھی ہوگئیں لیکن یہ شخصیت کہیں نظر نہ آئی اور نام ان کا سری نگر کے ہر شخص کی زبان پہ ہے۔ اکبر نے یہ کہہ کے بات ختم کی۔ یہ عجیب وغریب شخصیت ہے کبھی ملواؤں گا۔ لیکن اس سفر میں ڈی۔ پی سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں صرف نام ہی بار بار سن کے دہلی واپس آگیا۔

اگلے برس پھر ایک مشاعرے کے سلسلے میں کشمیر آنے کی صورت پیدا ہوئی۔ اب کے باہر سے آنے والے شعراء کی تعداد قدرے زیادہ تھی۔ ان میں مجاز بھی تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں دوسری بار سری نگر آرہا ہوں۔ ڈی۔ پی دھر کا نام بہت سن رکھا ہے۔ لیکن ملاقات نہیں ہو رہی ہے۔ اس مشاعرے میں تم ہو، فراق ہیں، جوش ہیں، میرے والد ہیں، روش ہیں، ساغر ہیں۔ کیا ڈی۔ پی۔ دھر صاحب کو شعروادب سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ کسی سے ملنے نہیں آئے۔ میں تو صرف انھیں دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ نام ان کا اتنا سنا ہے کہ خواہش

ملاقات بڑھتی ہی جارہی ہے۔ بولے ڈی۔ پی وہ تو ہمارا دوست ہے، مخدوم کا دوست ہے سردار کا دوست ہے ـــــ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا مخدوم اور سردار کا نام نہ لو۔ وہ دونوں جیل میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا ذکر کرنے کے جرم میں ہم بھی پکڑے جائیں۔ مجازؔ نشے میں تھا لیکن بڑے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگا تم میری فکر نہ کرو۔ میں تو جیل جاکر بھی مزے میں رہوں گا۔ تم اپنی فکر کرو۔ تم حکومت کے ملازم ہو، کہیں تمھاری نوکری نہ جاتی رہے۔

لیکن مجاز اور ڈی۔ پی کی دوستی کے باوجود ڈی۔ پی سے ہم لوگوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔

اس بات کو زمانہ گزر گیا۔ بنے بھائی سکھر (پاکستان) جیل سے رہا ہو کر ہندوستان آگئے اور لکھنؤ چھوڑ کے انھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا۔ ایک دن مجھے ان کی طرف سے پیغام ملا کہ آج شام کو کشمیر ہاؤس پہنچو۔ تمھیں ایک محبوب شخصیت سے ملواؤں گا۔ میں نے براہِ راست کشمیر ہاؤس جانے کے عوض بنے بھائی کے گھر جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہاں سے ہم دونوں کشمیر ہاؤس گئے۔ ڈی۔ پی دھر کو بنے بھائی کے لیے سراپا اشتیاق پایا۔ میرا تعارف بنے بھائی نے کرایا۔ میں نے چھوٹتے ہی غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

شعر سن کر پھڑک اٹھے اور بولے مجھے تمھارے کشمیر آنے کا سب علم ہے۔ بات یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کے تنظیمی کاموں کے سلسلے میں مجھے اکثر وادی کے دیہات کا دورہ کرنا پڑتا ہے۔ سری نگر میں قیام کا موقع کم ملتا ہے۔ لیکن اب چونکہ کانفرنس کی تنظیم مضبوط ہو چکی ہے۔ اب تم آؤ گے تو سری نگر میں ملاقات ہوگی۔

اِس ملاقات میں بنے بھائی پاکستان میں اپنی گرفتاری اور زنداں کے روز و شب کی داستان سناتے رہے۔ داستان کیا تھی سن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ فیض کے بارے میں ڈی۔ پی بار بار پوچھتے تھے۔ اور بنے بھائی ان کو ہر بار کوئی نہ کوئی نئی بات بتاتے تھے۔

اس محفل کا طول و عرض زیادہ تر ذکرِ فیض ہی تک محدود رہا۔ میں نے دیکھا کہ ذکرِ فیض ڈی۔ پی کے لیے ذکرِ محبوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ فیض کے اشعار انھیں بہت یاد تھے اور اکثر اس بات چیت کے دوران میں وہ فیض کے اشعار سناتے رہے۔

اس محفل سے اٹھ کے جب میں بنے بھائی کے ساتھ ان کے مکان پر گیا تو انھوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ یہ ڈی۔ پی۔ دھر کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پہلی ملاقات ہی میں میں ایک سرشاری کی کیفیت لے کے آیا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ سری نگر میں پھر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ حکومت کے دفاتر جموں میں تھے۔ سردار جعفری، غلام ربانی تاباں اور میں سری نگر سے جموں پہنچے تو پتہ چلا کہ دن کے کھانے کی دعوت ڈی۔ پی۔ دھر کی طرف سے ہے۔ صادق صاحب مرحوم بھی اس دعوت میں شریک تھے ممکن ہے یہ دعوت حکومت ہی کی طرف سے ہو۔ بہر طور ہمارے لیے دونوں ہی میزبان تھے۔ یہ دعوت گیسٹ ہاؤس کے سرسبز و شاداب لان پر ہوئی۔ پروگرام ہم لوگوں کا یہ تھا کہ بس یا ٹیکسی کے ذریعے سے ہمیں پٹھان کوٹ پہنچنا تھا اور وہاں سے ریل کے ذریعے دہلی۔ لیکن کلام کے بعد جب طعام کا دور شروع ہوا تو ڈی۔ پی صاحب نے ہم تینوں سے کہا کہ آپ لوگ آج دہلی نہیں جا سکتے۔ آپ کو کم از کم یہاں دو دن قیام کرنا ہے۔ جعفری اور تاباں نے تو یہ تجویز فوراً قبول کر لی۔ مجھے تامل تھا اس لیے کہ دوسرے دن دفتر میں حاضری تھی۔ میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ڈی۔ پی نے کہا تمھارے دفتر میں ٹیلی فون کر دیا جائے گا اور جموں میں قیام کی مدت ڈیوٹی میں شمار ہوگی۔ لیکن میرے لیے مسئلہ ڈیوٹی یا چھٹی کا نہیں تھا بعض کام میں دفتر میں نامکمل چھوڑ کے آیا تھا۔ جن کی فوری طور پر تکمیل ضروری تھی۔ اس لیے میں اس صورت حال سے ذرا پریشان ہوا۔ حتیٰ کہ اسی عالم میں ٹیکسیوں اور بسوں کا وقت نکل گیا۔ میں بات چیت، کھانے پینے، گپ شپ میں شریک تھا لیکن غالباً یہ حقیقت میرے حرکات و سکنات سے نمایاں تھی کہ میں جموں میں رک جانے کے باعث بہت پریشان ہوں تاباں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ عجیب بد مذاق آدمی ہو، ایسی عمدہ محفل یاراں کو چھوڑ کے دہلی جانا چاہتے ہو۔ سردار نے کہا کہ یہ کیا تم نے دفتر دفتر کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اب چھوڑو دفتر کے ذکر کو۔ ڈی۔ پی صاحب میری اس پریشانی کا لطف اٹھا رہے تھے لیکن دراصل انھوں نے اس بات کا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کی کار عین وقت پر مجھے پٹھان کوٹ پہنچا دے گی۔ چنانچہ رات کے ساڑھے آٹھ یا نو بجے کے قریب انھوں نے مجھ سے کہا "تم پریشان نہ ہو، یہ گاڑی موجود ہے۔ اس میں بیٹھو یہ تمھیں ریل چھوٹنے سے قبل پٹھان کوٹ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دے گی اور تم کل صبح دفتر میں موجود ہو گے۔"

میں اس وقت تک یہ محسوس کر رہا تھا کہ سردار اور تاباں تو ڈی۔پی کے سیاسی رفیق ہیں میری کوئی سیاست ہی نہیں صرف اشتراکی خیالات رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ہوں تو میں حکومت کا ایک افسر۔ مجھے ڈی۔پی صاحب پٹھان کوٹ بھجوانے کا کیوں خاص طور سے انتظام کرنے لگے لیکن جب میرے کہے بغیر از خود انھوں نے یہ انتظام کر دیا تو میں جہاں اپنی نظر میں گر گیا وہاں ڈی پی میری نظر میں کہیں زیادہ بلند ہو گئے۔

اسی طرح ڈی۔پی کے ساتھ کبھی کبھار کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ایک ایسی ہی ملاقات کی بات ہے اور یہ ملاقات قطعاً اتفاقیہ ہوئی۔میں بنے بھائی کے گھر ان سے ملنے گیا تو ڈی۔پی وہاں موجود تھے۔موضوعِ گفتگو ایفرو ایشیائی کانفرنس تھا۔جو غالباً مصر میں یا نہ جانے کہاں منعقد ہونے والی تھی۔میرے لیے دلچسپی اس بات میں اس لیے کم تھی کہ اس قسم کی کانفرنس میں کوئی ایسا شاعر یا ادیب شریک نہیں ہو سکتا جو حکومت کا ملازم ہو۔مجھے خاموش دیکھ کے ڈی۔پی بولے بنّے اب خشک بات چیت کو ختم کرو۔آزاد آئے ہیں۔کوئی شعر و شاعری کی بات ہو اور مجھ سے کہا آزاد فیض کا کوئی شعر سناؤ۔ بنے بھائی نے خلافِ معمول بڑی تیزی سے ڈی۔پی کو ٹوکا کہ یہ بڑی بے تکی بات ہے کہ ایک شاعر سے دوسرے شاعر کا کلام سنانے کے لیے کہا جائے۔کلام سننا ہے تو آزاد سے اس کا اپنا کلام سنو اور یا پھر اس سے اقبال کا کلام سنانے کی فرمائش کرو جس کا یہ عاشق ہے۔اب ڈی۔پی مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔کیا فیض کا کلام آپ کو پسند نہیں۔میں نے کہا نہیں، ایسی بات نہیں۔فیض کے اکثر اشعار مجھے زبانی یاد ہیں۔اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فیض میرے پسندیدہ شاعروں میں ہے۔لیکن بنے بھائی کی یہ بات صحیح ہے کہ میرا محبوب ترین شاعر اقبال ہے فیض نہیں۔

اب بات چیت کا رخ اقبال کی شاعری کی طرف ہو گیا اور ڈی۔پی نے بنے بھائی پر براہِ راست حملہ کرتے ہوئے کہا۔ بنّے تم لوگوں نے اقبال کے کمالِ فن کو نظر انداز کر کے کوئی عمدہ بات نہیں کی۔ بنے بھائی کا جذبہ اشتراکیت بلکہ جذبہ اشتمالیت اس وقت بڑی شدت سے ابھرا اور کہنے لگے کہ میں کسی رجعت پسند شاعر کو اچھا شاعر نہیں سمجھ سکتا۔اس پر ڈی۔پی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا لیکن میں بنّے بھائی کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ان کے ساتھ اقبال کے کلام پر میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اس قسم کی ملاقاتیں اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔لیکن کیفیت کے اعتبار سے ایسی

ہیں کہ میں انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور انھی یادوں کے آئینے میں اس محبوب دوست کا چہرہ آج بھی چمک دمک رہا ہے۔

پھر ایک دور ایسا آیا کہ ڈی۔ پی دھر ہمارے سفیر بن کے روس چلے گئے۔ بعد میں مرکز میں وزیر بنے۔ اس دوران میں ان کے ساتھ ملاقاتیں صرف سری نگر میں ہوئیں۔ اور ان ملاقاتوں کا طول و عرض زیادہ تر اتنا ہی رہا جو میرے فرائض منصبی کی انجام دہی کے لیے ہونا چاہئے تھا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب کسی حد تک ڈی پی دھر کی بے اندازہ مصروفیات ہوں اور کسی حد تک میرا اپنا مزاجی رجحان۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اس دوران میں وہ فاصلہ حائل رہا جو نہیں رہنا چاہئے تھا۔ لیکن ایک دن اچانک یہ فاصلہ کم ہو گیا۔ صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں لیکن غالباً دسمبر ۱۹۷۴ء کی بات ہے حیدرآباد میں کل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی کے زیر اہتمام دوسرا اقبال سمینار منعقد ہوا۔ (پہلا علی گڑھ میں منعقد ہو چکا تھا) اس میں شرکت کے لیے میں سری نگر سے حیدرآباد پہنچا۔ ڈی۔ پی صاحب صدارت کے لیے دہلی سے تشریف لائے اور اتفاق سے ایک ہی گیسٹ ہاؤس میں ہم دونوں کے قیام کا انتظام ہوا۔ سردار جعفری، عمیق حنفی، اسلوب احمد انصاری، گوربچن سنگھ طالب اور کرتار سنگھ دگل بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں تھے۔ ڈی پی صاحب کا طیارہ شام کو حیدرآباد پہنچا ان کے آنے سے قبل ہی اسلوب احمد انصاری اور عمیق حنفی سیر کو نکل گئے تھے۔ سردار جعفری کو راشد آذر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں اپنا مقالہ جو مجھے اگلے دن پڑھنا تھا مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ تازہ دم ہونے کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا تو کرتار سنگھ دگل برآمدے میں چہل قدمی کرتے نظر آئے۔ پتہ چلا کہ ڈی۔ پی صاحب بھی آئے ہیں اور ساتھ والے کمرے میں ہیں۔ میں نے دگل سے پوچھا ملنا چاہئے؟ کیا مشورہ ہے؟ دگل نے کہا تکلف کس بات کا ہے۔ چلو اندر چلیں اور دگل مجھے لے کے ڈی۔ پی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈی۔ پی چائے پی رہے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی خلاف توقع کھڑے ہو گئے اور دو قدم آگے بڑھ کے مصافحہ کیا۔ میری نظر میں چند برس پہلے کا زمانہ پھر گیا۔ چائے پینے کو کہا۔ ہم دونوں نے معذرت کی۔ بولے مجھے سردار نے بتایا ہے کہ آپ نے "جاوید نامہ" کا اردو ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں سردار ہی کی فرمائش پر یہ کام میں نے ہاتھ میں لیا تھا۔ اور اب چند ماہ کی محنت کے بعد مکمل ہو گیا ہے۔

کہنے لگے بہت بڑا کام ہے اور فوراً ہی دوسرا سوال انھوں نے کیا آخری باب کا ترجمہ بھی کیا ہے یا اسے چھوڑ دیا ہے؟ میں نے کہا آخری باب کا ترجمہ بھی کر لیا ہے کیونکہ میں اسے 'جاوید نامہ' کا ہی حصہ سمجھتا ہوں۔ بولے آرتھر آربری نے اس باب کو اپنے ترجمے میں شامل نہیں کیا۔ مجھے ان کی اس وسعتِ مطالعہ پر حیرت ہوئی۔ کیونکہ اقبال یا فیض کی شاعری سے دل چسپی رکھنا اور بات ہے اور آرتھر آربری کے ترجمے تک پہنچنا دوسری بات۔ یہ خالص ذوقِ علم کا ثبوت ہے۔ میں نے کہا شاید آرتھر آربری اس باب کو 'جاوید نامہ' کا حصہ نہیں سمجھتے تھے اور ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتایا کہ محمود احمد نے بھی اس آخری باب کا ترجمہ نہیں کیا۔ بولے "محمود احمد کون؟ میں نے یہ ترجمہ نہیں دیکھا" میں نے کہا جموں یا کشمیر کے کوئی صاحب ہیں۔ ذاتی طور پر تو میں بھی نہیں جانتا۔ گورنمنٹ کالج میر پور کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ ڈی۔ پی صاحب کو یاد آگیا کہنے لگے ہاں یہ صاحب جموں میں ریڈر تھے۔

اس پر دگل نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اب باتیں ختم کرو انھیں آرام کرنے دو۔ اور ہم دونوں اجازت لے کر اٹھ آئے۔

اگلے دن جوبلی ہال میں اجلاس شروع ہوا۔ ڈی۔ پی صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس خاکسار کی مرتب کی ہوئی اقبال نمائش اور ترجمۂ 'جاوید نامہ' کا خاص طور سے ذکر کیا۔

لیکن اس سے زیادہ اہم بات اس موقعے کی یہ ہے کہ ڈی۔ پی کے خطبۂ صدارت کے بعد جب اجلاس کافی کے لیے برخاست ہوا تو کافی کی میز ہی پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اور میں مل کے اقبال اور کشمیر کے موضوع پر ایک کتاب لکھیں۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اور ذرا غور کرنے کے بعد عرض کیا، خیال عمدہ ہے۔ کہنے لگے آپ دہلی کب آ رہے ہیں۔ میرے جواب پر کہ دو ایک دن میں، بولے مجھ سے ملنا۔ اس موضوع پر بات کریں گے۔

دو دن بعد جب میں دہلی پہنچا تو ڈی۔ پی دہلی سے باہر تھے۔ ملاقات نہ ہو سکی۔ چند روز بعد پھر میرا دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کے میں ان سے ملنے کے لیے ان کے دولت کدے پر پہنچا۔ اس دوران ان کا پھر ماسکو میں سفیر مقرر ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں جب کوٹھی پر پہنچا تو آپ پیچھے کے لان میں پی۔ این دھر کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے۔ اس بات چیت کے ساتھ چہل قدمی بھی جاری تھی۔ اس چہل قدمی کے دوران میں باتیں کرتے ہوئے

سامنے کے لان تک آپہنچے، مجھے دیکھا تو اِسی حیدر آباد والے تپاک سے ملے اور پی۔ این دھر سے کہنے لگے میں اور آزاد "اقبال اور کشمیر" کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ پی۔ این دھر صاحب نے کہا اس موضوع پر کتاب کیا لکھی جا سکے گی۔ دو چار صفحے کا میٹریل ہی دستیاب ہو سکے گا۔ ڈی۔ پی صاحب نے میری طرف دیکھا۔ گویا مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ جواب دو۔ میں نے کہا ایسی بات نہیں ہے۔ میٹریل بہت موجود ہے۔ اسے مختلف جگہوں سے جمع کرنا ہے اور مرتب کرنا ہے۔ اچھی ضخامت کی کتاب بن سکتی ہے

تھوڑی دیر بعد پی۔ این دھر اجازت طلب ہوئے اور ڈی۔ پی مجھے لے کے اسی پشت والے لان کی طرف چلے۔ اور باتوں اور چہل قدمی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان ہی باتوں کے دوران میں کتاب کا اچھا خاصا پلان بن گیا اور طے یہ ہوا کہ اب جب ڈی۔ پی صاحب ماسکو سے واپس آئیں تو ایک بار پھر ان سے ملوں اور اب کے ڈی پی صاحب ماسکو سے آکے دہلی سے ہوتے ہوئے سری نگر آئے۔ ان دنوں میں سری نگر میں نہیں تھا۔ واپسی پر مجھ سے میرے دوست پران ناتھ جلالی نے کہا کہ تم اتنے دن کہاں رہے۔ ڈی۔ پی صاحب تمھیں بار بار یاد کرتے رہے یہی بات عزیزی وجے دھر نے کہی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کیونکہ ڈی۔ پی صاحب واپس ماسکو جا چکے تھے۔ کچھ مدت بعد ڈی۔ پی صاحب پھر ماسکو سے سری نگر تشریف لائے۔ میں ان سے ملنے گیا۔ اوپر کے باہر والے کمرے میں ملاقاتیوں کا ایک ہجوم تھا۔ ان میں یونی ورسٹی کے طلبہ کی بھی خاصی تعداد تھی۔ ڈی پی اندر کے کمرے میں کسی ملاقاتی سے محو گفتگو تھے۔ تھوڑی دیر میں باہر آئے۔ یونی ورسٹی کے طلبہ کے ساتھ کھڑے کھڑے باتیں شروع کیں تو بولے میں ذرا بیٹھ جاؤں۔ بوڑھا ہوں۔ اس پر ہم سب ہنس پڑے۔ کیونکہ نہ ان کی چال ڈھال پر بڑھاپے کے آثار تھے نہ چہرے پر تھکن کے حسب معمول تازگی اور شگفتگی ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ جب سب سے مل لیے تو مجھے لے کے اندر والے کمرے میں چلے گئے۔ کتاب کے پلان کے بارے میں پوچھا۔ میں اس وقت تک آؤٹ لائنز تیار کر چکا تھا۔ وہ انھیں دکھائیں۔ بولے ۳۲-۱۹۳۱ء کے واقعات سے متعلق میرے پاس بے اندازہ یادداشتیں ہیں۔ وہ میں آپ کو مرتب کر کے دوں گا۔ پھر پوچھنے لگے اس کے لیے میٹریل جمع کرنے آپ کو کہاں کہاں جانا ہوگا۔ اس موضوع پر مختصر سی بات پہلے بھی ہو چکی تھی۔ میں نے ہندوستان کے بعض جگہوں کا نام بتایا اور کہا کہ لاہور اور کراچی جانا بھی ضروری ہوگا۔ کہنے لگے آپ اس کی فکر نہ کریں۔

میں نے فلاں صاحب سے بات کرلی ہے۔ وہ سارا انتظام کردیں گے۔ آپ صرف سفر کا پروگرام بنائیے اور جلدی بتائیں تاکہ کام جلد از جلد شروع ہو سکے۔ آپ کل ہی سارے سفر کا پروگرام بنا کر مجھے دکھا دیں۔ میں دہلی جاکے گجرال صاحب سے بھی بات کر لوں گا تاکہ آپ کو طویل چھٹی ملنے میں دشواری نہ ہو بلکہ ہو سکے تو قیام پاکستان کی مدت آپ کے فرائض منصبی میں شمار ہو۔

دوسرے دن میں ابھی ان سے ملنے کے لیے دفتر سے چلا ہی نہیں تھا کہ کسی نے آکے بتایا کہ ڈی۔ پی صاحب کی طبیعت آج صبح سے خراب ہے۔ غالباً دل کا دورہ پڑا ہے۔ ڈاکٹروں نے ملنے جلنے سے منع کر دیا ہے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ کیونکہ کل تک تو کسی طرح کی بیماری کے کوئی آثار مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔ میں اب شش و پنج کے عالم میں تھا کہ ان کے گھر جاؤں یا نہ جاؤں، جب ڈاکٹروں نے ملنے ہی سے منع کر دیا ہے تو عیادت یا مزاج پرسی کے لیے جلنے سے کیا حاصل۔ اور ایک آدھ گھنٹے میں یہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹروں کی زیر ہدایت ڈی۔ پی صاحب کو علاج کے لیے دہلی روانہ کر دیا گیا ہے۔

اب دہلی سے ان کی علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں جن میں امید کی جھلک کم اور مایوسی کی کیفیت زیادہ ہوتی تھی۔ اور آخر کچھ دن بعد وہ خبر سری نگر پہنچی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ڈی پی صاحب ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ــــ!

شام کا وقت تھا۔ وادیٔ کشمیر کے گوشے گوشے سے لوگ سری نگر کے ہوائی اڈے کی طرف جا رہے تھے۔ اداس، غم ناک، خاموش ان میں ہر طبقے کے لوگ تھے ــــ وقت مقررہ پر ایک طیارہ ہوائی اڈے پر اترا۔ طیارے کا دروازہ کھلا اور ڈی۔ پی صاحب کے دوست شمیم احمد شمیم، ان کے فرزند وجے دھر اور دوسرے اعزہ و اقربا پھولوں سے لدی ہوئی ایک لاش کو لے کر باہر نکلے۔ ہوائی اڈے کی فضا آہوں اور سسکیوں سے لبریز ہو گئی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نم نہ ہو۔ کوئی زبان ایسی نہ تھی جو مرنے والے کی خوبیوں کا ذکر نہ کر رہی ہو۔

میں نے بھی ان کے ہزاروں چاہنے والوں کی طرح لاش کے قریب پہنچ کے آخری اظہار عقیدت کیا۔ لاش کو ایک بڑے ٹرک پر رکھ دیا گیا۔ یہ اس محبوب شخصیت کا آخری سفر تھا اور میرا اس ہنس مکھ چہرے کا آخری دیدار۔

بنّے بھائی

۱۳ر ستمبر کی بات ہے۔ شام کے وقت میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ نیچے گھر کے لوگ ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے کہ میری بیوی گھبراہٹ کے عالم میں اوپر آئی اور بولی بنّے بھائی ان دنوں کہاں تھے؟ میں نے سر اوپر اٹھایا اور کہا کہاں تھے یا کہاں ہیں؟ پچھلے دنوں جب میں دہلی میں تھا تو وہ ماسکو گئے تھے۔ شاید وہاں سے اُن کا لندن جانے کا ارادہ بھی تھا واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟ وہ انتہائی افسردہ لہجے میں کہنے لگی ابھی ٹیلی ویژن پر خبر آئی ہے ـــ اس کی بات ابھی نامکمل ہی تھی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پھر بھی میں نے سوال کر ہی دیا۔ کیا خبر آئی ہے؟ بولی بنے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ سنتے ہی پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تاہم یقین نہ آیا اور جلدی سے نیچے ٹیلی ویژن والے کمرے میں آیا جیسے کہ ٹیلی ویژن کا نیوز ریڈر میرے انتظار میں اس ایک خبر پر رکا ہوا ہوگا۔ خبریں آگے چل چکی تھیں۔ بچوں نے تائید کر دی ابھی نیوز ریڈر نے بتایا ہے کہ سجاد ظہیر چچا کا روس میں انتقال ہو گیا ہے۔

ـــ اور میں خیالات میں ڈوب گیا۔ کیا بنّے بھائی کی نعش روس ہی میں دفن کی جائے گی یا ہندوستان لائی جائے گی ـــ اور پھر پینتیس برس کے واقعات ایک فلم کی طرح میری نظر کے سامنے گھومنے لگے۔

۳۷ء کا زمانہ ہے۔ میرے والد گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو کے استاد ہیں۔ اٹھارہ انیس برس کی میری عمر ہے۔ ایک نوجوان ہمارے گھر میں آتا ہے۔ ادب میں ترقی پسندی

پر باتیں ہوتی ہیں۔ والد کہتے ہیں لیکن میں ترقی پسندی کی فحاشی اور عریانی کو برداشت نہیں کر سکتا وہ نوجوان جواب دیتا ہے۔ محروم صاحب! ترقی پسندی کے مخالفوں نے یہ باتیں ترقی پسندی کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہیں۔ ان چیزوں کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں ہے علامہ لاہور میں مجھ سے علامہ اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔ یہ ہمارے مخالفوں کا پروپیگنڈا ہے۔

والد یہ ساری بات سن کر کہتے ہیں تم کل ہمارے کالج میں ادب میں ترقی پسندی کے موضوع پر تقریر کرو تاکہ کالج کے دوسرے اساتذہ اور طلبہ کو بھی بحث میں حصہ لینے کا موقع مل سکے۔

یہ نوجوان سید سجاد ظہیر تھے۔ سر وزیر حسن مرحوم کے فرزند۔ نکھرا ہوا گورا چٹا رنگ، نکلتا ہوا قد۔ مجھے ان کا یوپی کا شستہ لب و لہجہ بہت بھلا لگا۔

اور دوسرے دن گارڈن کالج راولپنڈی میں سجاد ظہیر کی تقریر ہوئی۔ والد نے صدارت کی۔ سجاد ظہیر نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا اس سے زیادہ مجھے ان کے لب و لہجہ سے دلچسپی رہی۔ کتنی عمدہ اردو میں وہ بول رہے تھے۔ جیسے کانوں میں رس گھول رہے ہوں۔

سجاد ظہیر نے یہ سارا واقعہ اپنی تصنیف "روشنائی" میں اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اردو کی ادبی دنیا میں راولپنڈی کی سب سے مشہور ہستی پنڈت تلوک چند محروم کی تھی۔ پنڈی کی انجمن یا گارڈن کالج کی اردو سوسائٹی کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر مجھے تقریر کرنا تھی، مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ جب میں نے جلسے میں پہنچنے کے بعد دیکھا کہ حضرتِ محروم اس کے صدر ہیں۔ وہ گارڈن کالج میں اردو، فارسی کے پروفیسر تھے اور اُن کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہو گی۔ ایسے زبان داں اور قدیم مکتبِ خیال کے قابلِ احترام استاد کے سامنے زبان کھولتے ہوئے مجھے کافی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے بولا۔ میری تقریر کے خاتمے پر پنڈت جی نے فرمایا کہ میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں دوسرے خیالات رکھتا تھا، لیکن اگر اس کے مقاصد وہی ہیں، جو اس جلسے میں بیان کیے گئے تو اس سے بھلا کیسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ میں نے اُن کے اس

جلسے کو تحریک کے اور اپنے لیے باعثِ برکت سمجھا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ چند برس بعد ہندوستان کے دو حصے ہو گئے۔ ہندوستان اور پاکستان۔ میں راولپنڈی اور لاہور کو چھوڑ کر دہلی آگیا۔ ترقی پسند تحریک سے میری دل چسپی کا صحیح معنی میں آغاز دراصل تقسیم ملک کے بعد ہی ہوا۔ اس زمانے میں سجاد ظہیر کا نام ہر زبان پر تھا لیکن سجاد ظہیر خود کہاں تھے ۔۔۔ پاکستان میں۔ کمیونسٹ پارٹی نے انھیں پارٹی کی تنظیم کے لیے پاکستان بھیج دیا تھا۔ انھیں وہاں گئے تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی کہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں گرفتاریوں کا ایک چکر شروع ہو گیا جس میں فیض احمد فیض اور جنرل اکبر خاں کے ساتھ سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے امیر کارواں تھے۔ ہم نووارد انِ شوق کے لیے ان کا نام ایک علامت بن گیا تھا۔ ایک سمبل بن گیا تھا۔ ان کی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر لکھنؤ میں تھیں۔ یہ مکان ہم لوگوں کے لیے ایک سجدہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لکھنؤ جانا ہو یا لکھنؤ سے گزرنا ہو میرے لیے اس مکان پر حاضری دینا، رضیہ بھابی اور بچوں سے ملنا ایک معمول بن گیا اور تھوڑی ہی مدت میں صورت حال ایسی ہو گئی تھی جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں۔

ادھر سکھر جیل سے بنّے بھائی کے خطوط رضیہ بھابی کے نام خاصی باقاعدگی سے آرہے تھے یہی خطوط بعد میں "نقوشِ زنداں" کے نام سے شائع ہوئے۔ ایک خط میں میرا ذکر بھی تھا اور وہ یوں کہ ایک مقالے میں پاکستان کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے میں نے حفیظ جالندھری کو اردو کے اہم ترین شعراء میں شمار کیا تھا۔ یہ مقالہ "شاہراہ" میں چھپا تھا اور بنّے بھائی کی نظر سے گزرا تھا۔ انھیں میرا زاویۂ نگاہ پسند نہ آیا اور انھوں نے لکھا، آزاد نے درپردہ حفیظ کو فیض پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے آزاد کی رجعت پسندی ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے نظریے کی شدت کا زمانہ تھا۔ رضیہ بھابی کو بھی میرے خیالات ناگوار گزرے تھے۔ لیکن اس سے ہمارے باہمی مراسم میں کوئی فرق نہ آیا۔

سکھر جیل سے سجاد ظہیر کے خطوط حکومت پاکستان کے سنسر کی قینچی سے گزر کر لکھنؤ تک پہنچتے تھے۔ بعض خطوط تو جوں کے توں مل جاتے تھے۔ بعض میں اکثر فقروں پر اس طرح سیاہی پھری ہوتی تھی کہ سارا مفہوم غتر بود ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں وزیر حسن منزل میں پہنچا۔ بنّے بھائی کی بیٹی نسیم نے مجھے بنّے بھائی

کا ایک خط دکھایا جس کے اکثر فقروں پر سیاہی پھری ہوئی تھی۔ رضیہ بھابی نے کہا جگن اس خط نے تم پر اتنا اثر بھی نہیں کیا کہ تم اس کے بارے میں نظم کہہ سکو۔ نہ جانے ان کے الفاظ میں کیا طلسم تھا وہیں اس سنسر شدہ خط کے بارے میں فی البدیہہ ایک نظم ہو گئی جو اس طرح شروع ہوئی تھی۔

یہ اک معصوم فقرے پر سیاہی پھیرنے والو! | کسی نے وقت کی پرواز کو روکا بھی ہے اب تک
کسی بلبل کے نغمے تک کوئی صیاد پہنچا بھی | کسی نے گرمیِ آواز کو روکا بھی ہے اب تک
شکستِ انجام کوئی ساز ہو جائے تو ہو جائے | کسی نے نغمہ ہائے ساز کو روکا بھی ہے اب تک

کسی نے پھول کی خوشبو کو بھی زنجیر پہنائی
کسی نے گلستاں کے راز کو روکا بھی ہے اب تک

یہ الفاظِ محبت باپ نے بیٹی کو لکھے تھے | ان الفاظِ محبت سے یہ وحشت کس لیے آخر

جو اپنے باپ کا ہر لفظ پڑھ لیتی تو کیا ہوتا
یہ اک معصوم بچی سے عداوت کس لیے آخر

یہ جن دو چار لفظوں پر سیاہی تم نے پھیری ہے | انہی لفظوں میں پوشیدہ ہے سورج کی درخشانی
مسلط ہے جو ظلمت آج اس ننھے سے فقرے پر | اسی ظلمت پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی یہ تابانی
یہی تحریر جس کو تم نے روکا ہے ابھرنے سے | جب ابھرے گی تو بن جائے گی اک سیلابِ نورانی
سفیدی پر سیاہی کی لکیریں کھینچنے والو! | یہ کب تک شانِ فغفوری یہ کب تک فرِ خاقانی
وہ دیکھو فکرِ انسانی سے ابھری نور کی دنیا | بڑھا دیتا ہے زنداں سے وہ اک سیلابِ نورانی

خدا حافظ تمھاری ان سیاہی کی لکیروں کا
معاذ اللہ موجِ نور کا اندازِ طغیانی

یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔

سجاد ظہیر ہمارے صف اوّل کے شاعر تھے، صف اوّل کے نثر نگار تھے لیکن نام و نمود سے کوسوں دور۔ حتیٰ کہ دہلی کی ادبی سرگرمیوں سے بھی دور ہی رہتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے لیکن سامع کی حیثیت سے۔ ہاں مشاعروں کے بعد جو مخصوص نشستیں ہوتی تھیں ان میں اپنا کلام بھی سنا دیتے تھے۔ ان نشستوں میں صدارت اکثر ان کے سپرد ہوتی تھی اور وہ اپنی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردو اور اس مسکراہٹ کے طفیل جو ہمیشہ اُن کے خوبصورت چہرے پر کھیلتی رہتی تھی محفل کو شگفتہ تر بنا دیا کرتے تھے۔ ایسی محفلوں

میں مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے۔ جگن ناتھ تم میرے قریب آکر بیٹھ جاؤ، تمھاری مدد کے بغیر میں صدارت نہیں کر سکوں گا۔ دو چار محفلوں میں جب انھوں نے ایسا کہا تو تاباں اور بعض دوسرے دوستوں نے ازراہِ مزاح مجھے نائب صدر کا لقب دے دیا۔ جس محفل میں بنّے بھائی موجود ہوں اور میں نہ پہنچ سکوں تو یاروں کا فقرہ اکثر یہ ہوتا تھا بھئی ذرا ٹھہر جاؤ ابھی نائب صدر تو آئے نہیں یا اگر میں موجود ہوں اور بنّے بھائی نہ ہوں تو تان کچھ ایسے ہی فقرے پر ٹوٹتی تھی کہ لیجئے نائب صدر آگئے اور صدر ابھی تک نہیں آئے۔

کوئی دو چار برس کی بات ہے۔ بنّے بھائی صادق صاحب مرحوم کی دعوت پر کشمیر تشریف لائے۔ رضیہ بھابی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ صادق صاحب ہی کے مہمان رہے۔ میری تقریباً ہر شام ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ اسی قیام کے دوران میں کشمیر میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے قیام کا ذکر آیا اور یہ طے پایا کہ سری نگر میں از سرِ نو انجمن قائم کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرے ہی دفتر میں مسلسل کئی روز تک وہ آتے رہے۔ بحث مباحثے ہوئے۔ مسودے بنے اور طے پایا کہ کشمیر ڈیموکریٹک رائٹرس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادبی تنظیم کشمیر میں قائم کی جائے۔ چنانچہ یہ تنظیم قائم ہوئی۔ بنّے بھائی ہی نے اس کی بنیاد رکھی اور کوئی ڈھائی برس تک یہ تنظیم کشمیر میں علمی اور ادبی کام کرتی رہی۔

بنّے بھائی بھری بزم کے محبوب تھے اور ع ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ ان کا حلقۂ احباب کسی ایک ملک یا ایک برّاعظم تک محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان، پاکستان، روس کیوبا، مشرقی اور مغربی یورپ، امریکہ، انگلستان ہر جگہ ان کے چاہنے والے موجود تھے اور ہیں۔ اسی ہماری وادی میں ان کے عزیز دوستوں کی کمی نہیں ـــــ صادق صاحب مرحوم، ہمارے وزیرِ اعلیٰ سید میر قاسم، پیر غیاث الدین، موتی لعل مصری، ڈاکٹر مرزا، دینا ناتھ نادم اور کتنے ہی شاعر اور ادیب ان کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ یہ فہرست مکمل ہو ہی کہاں سکتی ہے

میری یہ مختصر سی بات چیت بنّے بھائی کی علمی، ادبی یا سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق نہیں ہے، ان کی نثر نگاری کے متعلق بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک یاد ہے۔ اس محبوب کی جسے ادب کی ترقی پسند تحریک میں امیر کارواں کا رتبہ حاصل تھا اور ہم جیسے پیار سے بنّے بھائی کہتے تھے۔ بنّے بھائی جو آج ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ہیں جن کے جانے سے ملک کی ادبی فضائیں اداس ہیں، جن کے جانے سے ہماری نگاہیں اجاڑ اور ویران ہیں اور جنھیں اب ہم کبھی نہ دیکھ سکیں گے ع ہمیشہ رہے نام اللہ!

(ڈیلی ریڈیو سینٹر سری نگر کے شکریے کے ساتھ)

سری نگر
۲۷ ستمبر ۱۹۷۳ء

کرشن چندر

(زیرِ تصنیف آپ بیتی "باتیں ہماری یاد رہیں" کے چند اقتباسات)

میرا قیام اس زمانے[1] میں موہنی روڈ پر موہنی ہوسٹل میں تھا۔ کرشن چندر کا مکان قریب تھا۔ کرشن کے افسانوں کی دھوم شروع ہو چکی تھی۔ "ادبی دنیا" کے سالنامے میں ان کا طویل مختصر افسانہ "منزل ہے کہاں تری" شائع ہوتے ہی ہندوستان بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ "ادبی دنیا" ہی کی طرف سے انھی دنوں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ غالباً اس کا نام "طلسم خیال" تھا۔

کرشن سے ملاقات کے شوق میں ایک دن میں ان کے گھر جا نکلا۔ دستک دی۔ مہندر ناتھ نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ انھوں نے بٹھایا۔ باتیں شروع کیں۔ ان کی باتوں میں مجھے ایک تپاک نظر آیا۔ تھوڑی دیر میں کرشن چندر اندر سے آئے۔ وہ آ کے بیٹھے تو مہندر ناتھ اٹھ کے چلے گئے۔

کرشن چندر میں مجھے وہ تپاک نظر نہ آیا جو مہندر ناتھ میں نظر آیا تھا۔ ان کے ساتھ بات چیت شروع کرنے میں مجھے کچھ دشواری بھی ہوئی کیونکہ یہ کچھ دیر مہر بہ لب ہی رہے۔ میں نے ان کے ساتھ بات چیت میں افسانے کا موضوع نہ چھیڑا۔ افسانوں کا مطالعہ تو میرا خاصا تھا لیکن افسانوں کے بارے

---

[1] یہ ۳۸-۱۹۳۷ء کے لاہور کا ذکر ہے۔

میں تنقیدی مطالعہ بہت کم تھا۔ کرشن چندر کے افسانے مجھے بہت پسند تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ آپ کے افسانے مجھے بہت پسند ہیں ایک عجیب اور نامناسب بات نظر آئی۔ اس لیے شعر و شاعری کو اپنا موضوع بنایا۔ فیض کے ذکر میں جب میں نے یہ کہا کہ فیض کے یہاں شگفتگی تو بہت ہے، تاثر بھی ہے لیکن زبان کی غلطیاں اس طرح کی ہیں اور انداز بیان کہیں کہیں اتنا کھرا ہوا ہے کہ پڑھتے ہوئے بہت کوفت ہوتی ہے تو کرشن نے کہا کہ شاعری میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اصل چیز خیالات ہیں۔ میں نے کہا خیالات کا ہونا تو ضروری ہے لیکن زبان و بیان کی اہمیت سے کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ شاعری تو خیالات و زبان و بیان اور جذبے کے امتزاج ہی سے ظہور میں آتی ہے۔ اگر خیالات کمزور ہیں یا زبان و بیان کمزور ہوں تو شاعری بحیثیت مجموعی کمزور ہی رہے گی۔ اس پر میں نے کرشن چندر کو اقبال کے متعدد اشعار سنائے "بالِ جبریل" کو شائع ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ مجھے وہ قریباً زبانی یاد تھی۔ میں نے "ذوق و شوق"، "ساقی نامہ" اور "مسجد قرطبہ" کے متعدد اشعار کرشن چندر کو سنائے۔ انھیں یہ اشعار پسند نہ آئے۔ وہ بار بار فیض اور راشد کا ذکر کرتے تھے۔ اور میں اقبال کے مقابلے میں فیض اور راشد کا ذکر سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ میں نے لفظوں میں تو اس بات کا اظہار نہ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس بات چیت سے بڑی حد تک مایوس ہوا اور بے لطف بھی۔ عمر کم ہو تو انسان ہیرا پھیری کی باتیں بھی نہیں کر سکتا اور اپنے موضوع پر اڑا رہتا ہے۔ اب تو اگر کسی کے ساتھ بات چیت کے دوران میں بے لطفی کی جھلک نظر آ جائے تو میں موضوع بدل لیتا ہوں لیکن اس وقت شعور میں اتنی "پختگی" کہاں تھی ؎

زباں پہ سچ کے سوا کچھ نہ تھا جب اے آزاد
وہ نیم پختہ خیالات یاد آتے ہیں

یہ بات مجھے ہر لمحہ پریشان کر رہی تھی کہ اتنا بڑا افسانہ نگار اور اردو کی اعلیٰ شاعری سے اس قدر بیزار۔ اصل میں بات یہ تھی کہ کرشن چندر بہت جدید تھے اور میں ان کے مقابلے میں عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود بہت قدیم۔ ایک تو میں کلام اقبال کا عاشق اور دوسرا مولانا تاجور مرحوم کا شاگرد۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کرشن کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد "ادبی دنیا" کے دفتر میں ان کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ چند برس تک جاری رہا۔ اور ان کے بارے میں میری رائے کہ وہ

تپاک سے خالی پن بدل گئی۔ اس زمانے میں کرشن غالباً سرکلر روڈ کی ایک پبلشنگ فرم میں "کریزر" نامی انگریزی ماہنامے کے مدیر تھے۔ ان کے افسانے بجلی کی سرعت سے دنیائے ادب میں آرہے تھے۔ اور بجلی ہی کی طرح ادبی ماحول کو برقا رہے تھے کچھ مدت میں کرشن آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ "نئے زاویے" کی دونوں جلدیں آپ نے اسی زمانے میں مرتب کی تھیں۔

انھی دنوں کی بات ہے۔ ایک دن میں مکتبہ اردو کی طرف جا رہا تھا۔ کرشن شاید اپنے دفتر سے آرہے تھے یا مکتبہ اردو سے۔ سرکلر روڈ پر ہم دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ کہنے لگے کل میں موہنی ہاسٹل گیا تھا تم سے ملنے۔ تم وہاں نہیں تھے۔ میں نے کہا، ہاں کل میں بہت دیر میں واپس پہنچا تھا۔ خیر باشد! بولے خیال آرہا تھا تم سے اقبال کا کلام سنا جائے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے سمجھا حضرت میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ مجھے جواب نہ سوجھا۔ جلدی میں میرے منہ سے نکلا، پرسوں شام کو میں نے ایس پی ایس کے ہال میں اقبال ہی کا کلام تو سنایا تھا۔ آپ تو وہاں موجود تھے۔ کہنے لگے وہیں سے تو یہ خیال پیدا ہوا کہ "بالِ جبریل" کی غزلوں کے بعض اشعار تم سے سنے جائیں۔ مجھے ان کی باتوں کا کچھ یقین نہ آیا کیونکہ ترقی پسندوں اور مجھ ایسے قدامت پسندوں میں ایک ایسی دیوار حائل تھی کہ ہمیں ایک دوسرے کی بات کا یقین مشکل سے آتا تھا۔ بولے کل ہمارے گھر آؤ۔ میں نے کہا گھر میں تو اُسی کرشن چندر سے ملاقات ہوگی۔ کہنے لگے کون سا کرشن چندر۔ میں نے جھٹ کہا جو پہلے صم بکم بیٹھا رہا اور جب بات کی تو خاصی روکھی پھیکی۔ اس پر کرشن نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ اس وقت تو ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اب تو دوست ہیں۔ اب انھیں کچھ یاد آگیا۔ بولے سنا ہے کل تم "ادبی دنیا" کے دفتر میں یوسف ظفر سے الجھ گئے اور اس بات پر مصر رہے کہ کرشن چندر پریم چند کے قدوقامت کا افسانہ نگار ہے۔ میں نے کہا الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن ہاں کچھ ایسی ہی بات میں نے کہی تھی۔ مجھ سے نصیحت کے انداز میں کہنے لگے کہ ادبی بحث میں کسی کے ساتھ الجھنا نہیں چاہیے۔ تنقیدی مقالے لکھنا شروع کرو تو یہ الجھنے کی عادت ختم ہو جائے گی جس دن تم مجھ سے پہلی بار ملنے آئے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ جب اقبال کے اشعار پر میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو تمھارے چہرے پر انقباض کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ ادبی بحث میں کسی بات کے برا ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

چلتے چلتے کہنے لگے کسی وقت گھر پر آئو باتیں رہیں گی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ہم نے محروم صاحب کو ریڈیو کے ایک پروگرام میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ آج ہی انھیں راولپنڈی خط لکھا ہے۔ مجھے اس اطلاع سے حیرت ہوئی۔ وہ تو یہ کہہ کے چلے گئے لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ ان حضرت نے مجھے ریڈیو کے پروگرام میں شرکت کی دعوت کبھی نہیں دی —— اس خیال کے آتے ہی میں کچھ کبیدہ خاطر ہو گیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ریڈیو کا پروگرام ملنے سے شاعر کے ادبی مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی اور ریڈیو پر میری فیس دس روپے تھی۔

تقسیم ہند کے بعد میں دہلی آیا تو کرشن بمبئی جا چکے تھے لیکن دہلی ان کا آنا جانا اکثر رہتا تھا مستقل طور پر دہلی میں ایک مکان بھی ان کے پاس ہمیشہ رہا۔ شاید اب بھی ہے[۱]۔ میں ان کی اس آمد و رفت کے دوران میں کرشن چندر کے بہت قریب آ گیا۔ کرشن کا مکان بلیو روڈ پر تھا اور میں پل بنگش میں مقیم تھا۔ گویا پیدل چلیں تو کوئی دس منٹ کا فاصلہ تھا۔ اس لیے میں اکثر ان کے گھر کی طرف جا نکلتا تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی پل بنگش ہی میں مقیم تھے۔ وہ ماہنامہ "شاہراہ" کو مرتب کرتے تھے۔ یوں تو ان کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہانہ تھی لیکن شاید ملتا ملاتا کچھ نہیں تھا۔ ساحر ایک متمول گھرانے کے فرزند ہیں۔ اس لیے "شاہراہ" کی تنخواہ ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ انھی دنوں میں مجھ سے ساحر نے بمبئی جانے کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ میوزک ڈائرکٹر برمن (یا کچھ ایسا ہی نام تھا) انھیں فلمی دنیا میں آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ - - - - - - - - - -

- - - - - - - ساحر نے مجھ سے کہا اگر تم بھی بمبئی آنا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ فلم میں تمھارا بھی انتظام ہو جائے گا۔ لیکن میں پبلی کیشنز ڈویژن میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ "آج کل" اور "بساط عالم" میں کام کرتا تھا جوش صاحب کی رفاقت میسر تھی۔ - - - - - - - - - - بمبئی جانے والی بات دل میں نہ بیٹھ سکی اور میں

---

[۱] یہ تحریر اگرچہ غیر مطبوعہ ہے لیکن آج سے بہت پہلے کی ہے کرشن اس زمانے میں زندہ تھے۔

"آج کل" کے دفتر ہی میں قلم گھسیٹتا رہا۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک دن دہلی میں ملاقات کے دوران میں میں نے کرشن چندر سے کہا میں اپنی نوکری سے بیزار ہوں چاہتا ہوں کہ استعفیٰ دے دوں۔ کرشن نے کہا یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ اس کے بعد تم بمبئی آؤ گے اور مجھ سے کہو گے کسی فلم میں کام دلوا دو۔ وہاں کسی کے لیے کچھ نہیں رکھا دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ فلمی دنیا میں قدم جمانا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ ہاں اگر روزگار کی ضرورت نہ ہو اور بمبئی آ کے رہنا چاہو تو میرے یہاں آ کے رہ جاؤ۔ دو شعراء وہاں پہلے ہی مقیم ہیں۔ تم بھی اس جماعت میں شامل ہو جاؤ۔ میں بے روزگاری کے تصور سے کانپ اٹھا۔۔۔۔۔

دہلی ہی کی بات ہے۔ کرشن بمبئی سے آئے تھے۔ خوشتر گرامی مدیر "بیسویں صدی" نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کی۔ دہلی کے شعراء اور ادیب خاصی تعداد میں وہاں موجود تھے دہلی کے میئر لالہ شام ناتھ بھی مہمانوں میں تھے۔ اسی روز میں کراچی کے ایک مشاعرے سے دہلی واپس آیا تھا۔ لالہ شام ناتھ نے نہ معلوم سنجیدگی سے یا ازراہِ مزاح مجھ سے کہا۔ آپ تو ہر روز مشاعروں میں شریک رہتے ہیں ہندوستان اور پاکستان میں کوئی شہر ایسا بھی ہے جہاں آپ نے مشاعرے میں شرکت نہ کی ہو۔ میری عمر اس وقت زیادہ تو نہیں تھی لیکن کم بھی نہیں تھی۔ مجھے ڈینگ مارنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں لاہور، راولپنڈی، سرگودھا، حیدرآباد، مدراس، بمبئی، ڈھاکا، چٹاگانگ اور کھلنا وغیرہ میں اپنی شرکتِ مشاعرہ کی باتیں شروع کر دیں۔ کرشن بھانپ گئے کہ میں اس وقت اپنی خودستائی کا پہلو نکال رہا ہوں اور مشاعروں میں شرکت کو معیار بنا کر محفل پر اپنی عظمت ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب میں نے بات ختم کی تو گویا یہ لیتی بغیر کہنے لگے آزاد تم چاہے کتنے ہی مشاعروں میں شرکت کیوں نہ کرو اور ان مشاعروں سے تمھیں کتنی آمدنی کیوں نہ ہو تمھاری تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت کوئی نقاد ان باتوں کو نہیں دیکھے گا۔ دیکھنے والے کو تو صرف اس سے غرض ہے کہ "بے کراں" اور "ستاروں سے ذروں تک" میں تم نے کیا لکھا ہے (اس وقت تک میری یہی دو کتابیں چھپی تھیں) میں اس وقت خاموش ہو گیا۔ لیکن کرشن کی یہ بات مجھے اچھی نہ لگی کیونکہ میں اس دور میں واقعی مشاعروں میں شرکت کے لاتعداد دعوت ناموں ہی کی بنا پر اپنے شاعرانہ مرتبے کا تعین کرنے کے فریب میں مبتلا

تھا۔ یہ واقعہ ۴۹ء یا ۵۰ء کا ہے ۔۔۔ اس کے بعد ملوخت کے ساتھ مجھے کرشن کی اس بات میں خاصا وزن نظر آنے لگا اور آج جبکہ اس واقعے کو بیس برس گزر چکے ہیں[1] میں سوچتا ہوں کہ ایک افسانہ نگار کی نصیحت کتنی بڑی حقیقت پر مبنی تھی۔

کرشن کے ساتھ میری آخری ملاقات سری نگر میں ہوئی۔ سن یاد نہیں آرہا لیکن اتنا یاد ہے کہ بخشی بھائی کی قائم کی ہوئی ڈیموکریٹک رائٹرز ایسوسی ایشن کشمیر میں کچھ مدت اچھی طرح سے چلنے کے بعد آخری دموں پر تھی۔ کرشن صادق صاحب مرحوم کی دعوت پر سری نگر آئے تھے۔ سرکٹ ہاؤس میں ان کا قیام تھا۔ سلمیٰ ان کے ساتھ تھیں اور سلمیٰ کا فرزند بھی۔ سرکٹ ہاؤس میں تو ان کے ساتھ ملاقاتیں رہتی ہی تھیں۔ ایک رات وہ میرے یہاں کھانے پر تشریف لائے اس وقت مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ سلمیٰ گوشت نہیں کھاتیں۔ کرشن بھی ان دنوں کسی حد تک پرہیزی کھانے پر تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں ہمارے نلوں میں صاف پانی نہیں آرہا تھا۔ ہم خود تو اسے ابال کے گزارہ کرلیا کرتے تھے۔ لیکن کرشن چونکہ کھانے پینے کے معاملے میں ویسے ہی بہت محتاط تھے۔ اس لیے میں دن میں خود ڈلگیٹ ناگ گیا اور ان کے لیے وہاں سے چشمے کا تازہ پانی لے کے آیا۔ اس کے پیچھے صرف وہ محبت کارفرما تھی جو کرشن کے لیے میرے دل میں تھی۔

میں ڈیموکریٹک رائٹرز ایسوسی ایشن کا سکریٹری تھا۔ کرشن سے میں نے کہا کہ آئندہ اتوار کو ہماری ایسوسی ایشن کے جلسے میں شریک ہوں اور اپنے خیالات سے اہلِ شہر کو مستفید کریں۔ کرشن نے میری درخواست مان لی۔ اخبارات میں ہم نے اس کا اعلان کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ اتوار والے جلسے میں سامعین بڑی بھاری تعداد میں آگئے اور ہال میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی۔ کرشن نے اپنی تقریر میں ان فسادوں کا ذکر کیا جو کچھ مدت قبل ملک کے مختلف حصوں میں ہو رہے تھے اور ان فسادات کے پس منظر میں اہلِ قلم کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اپیل کی کہ ڈیموکریٹک رائٹرز ایسوسی ایشن کو جاری رکھا جائے چنانچہ ان کی اپیل کا یہ اثر ہوا کہ ایسوسی ایشن میں جو قریب قریب ختم ہوچکی تھی اور جس کے جلسوں میں ادیبوں کی تعداد گرتے گرتے پانچ سات پر آگئی تھی، ایک نئی جان آگئی اور یہ تین چار سال اور کام کرتی رہی۔

---

[1] یہ ساری تحریر یہاں تک غیر مطبوعہ ہونے کے باوجود خاصی پرانی ہے۔ کئی برس پہلے کی ہے۔

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر سے بمبئی میں میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ چند ایک مشاعروں کو چھوڑ کر۔ اس کے ساتھ ملاقاتیں بمبئی سے باہر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ہوئیں اور زیادہ تر دہلی میں۔

ہندوستان کی تقسیم کا زمانہ ادب میں ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور اگست ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی میں میرا قیام ان تمام ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ قرب کا باعث بنا جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن جاں نثار اختر اس زمانے میں بھوپال میں تھے۔ حمیدیہ کالج میں صدرِ شعبۂ اردو۔

ذہنی اور جذباتی اعتبار سے میں ترقی پسند تحریک سے جس قدر قریب تھا عملی اعتبار سے اسی قدر دور۔ سرکاری ملازمت میرے اور تحریک کے درمیان ایک سدِ سکندری بن کے حائل تھی اس لیے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں سے بہ ذوق و شوق ملنے کے باوجود اپنے اور ان کے درمیان میرے لیے ایک حدِ فاصل رکھنا ضروری تھا۔ اس حدِ فاصل کے ہوتے ہوئے بھی اس زمانے میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سردار جعفری، ظ۔ انصاری اور ساحر لدھیانوی سے جی بھر کے ملاقاتیں ہوئیں۔ مجروح اور کیفی سے بھی لیکن ایک شاعر جس سے ملاقات کا موقع نہ ملا جاں نثار اختر تھا۔

اور میں جاں نثار سے ملاقات کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس کا لب و لہجہ غنائیت میں ڈوبا ہوا، دوسرے تمام شاعروں سے الگ تھلگ اور ممتاز نظر آتا تھا۔

آخر دہلی کے ایک انڈو پاکستان مشاعرے کے موقعے پر جاں نثار کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی جیمس فورڈ کلب کے بارے میں یہ غالباً ۴۸ء یا ۴۹ء کی بات ہے۔ جاں نثار اس مشاعرے میں مدعو نہیں تھے لیکن اس موقعے پر وہ دہلی میں تھے۔ سردار جعفری مدعو تھے۔ میرا اس مشاعرے کے انتظام میں تھوڑا بہت دخل تھا۔ جب سردار نے جاں نثار سے میرا تعارف کرایا تو مجھ پر ایک جھینپ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں اس بات کا اظہار نہ کر سکا کہ مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے وہاں سے اٹھ کے چلے آنے ہی میں مصلحت دیکھی۔

لیکن میں نے اس امر کی کوشش کی کہ جاں نثار کو اس مشاعرے میں باقاعدہ مدعو کر کے پڑھوالیا جائے۔ سوائے جوش صاحب کے کسی نے حامی نہ بھری اور جوش ایسے عالم میں تھے کہ منتظمین میں سے کسی نے اُن کی بات درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

یہ معاملہ خراب اس طرح ہوا کہ منتظمین جاں نثار اختر کو مقامی شاعر کے طور پر مدعو کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ میں اَڑ گیا کہ بمبئی سے آمد و رفت کا کرایہ بھی دیا جائے۔ وقت کے وقت یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، اور میری یہ خواہش کہ جاں نثار مشاعرے میں شریک ہو پوری نہ ہوئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے بے کار ضد کی۔ لیکن اس وقت مشاعرے کے بارے میں میرا نظریہ کچھ اور تھا۔ اب یہ نظریہ نہیں رہا۔ بہر طور جاں نثار اس پس منظر سے بے خبر رہے۔

یہ تھی جاں نثار سے میری پہلی ملاقات۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس قدر محجوب ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ سردار یا جاں نثار کی طرف سے تو اس بات کا اشارہ ہی نہیں ہوا تھا کہ جاں نثار کو شریک مشاعرہ کیا جائے۔ میں خواہ مخواہ ہی چور کی داڑھی میں تنکا، کے مصداق جھینپتا پھرتا تھا۔ حالانکہ مشاعرے کے انتظام سے میرا تعلق اتنا زیادہ نہیں تھا کہ میں انتظامیہ کمیٹی پر اثر انداز ہو سکتا۔

اس کے چند برس بعد جاں نثار اختر کے ساتھ گیا کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ ہم تینوں کا قیام سرکٹ ہاؤس میں تھا۔ ساحر کے ساتھ تو میرا دل و جان کا تعلق ایک مدت سے چلا آرہا تھا۔ جاں نثار سے پہلی مرتبہ کھل کے ملاقات ہوئی مشاعرے کے بعد بہت دیر تک گپ شپ کی محفل رہی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جاں نثار کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات نہیں ہے بلکہ ایک مدت سے شناسائی چلی آرہی ہے۔

مجھے یورپ سے واپس آتے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے۔ گپ شپ کے دوران میں سگار سلگانے کے لیے میں نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی۔ یہ ڈبیہ ان ڈبیوں کے مقابلے میں جو ہندوستان میں ملتی ہیں۔ کوئی چار پانچ گنا بڑی تھی۔ اسے انگلستان میں پیچ بکس کہا جاتا تھا۔ میں نے اسے اپنے لیے مفید مطلب پایا کیونکہ ماچس کی عام ڈبیہ سگار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ جاں نثار نے اس ماچس کو دیکھتے ہی کہا یہ کیا ہے بھئی اور پھر اسے ہاتھ میں لیتے ہی ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا عجیب پیچ بکس ہے یہ، اور پھر یہ قہقہہ ایک ختم نہ ہونے والے قہقہے میں تبدیل ہو گیا ـــــ قہقہہ اور وہ بھی اتنی معمولی سی بات پر۔ مجھے پہلے تو اس پر حیرت ہوئی لیکن ساتھ ہی ہنسی بھی آگئی۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ ہنسی بلکہ قہقہے کا دورہ ساحر پر بھی پڑ چکا ہے۔ بے اختیار مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کے قابل نہیں ہے کہ بھئی اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آخر خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما اور طوفان کے تھمتے ہی جاں نثار کے منہ سے بمشکل اتنا نکلا کہ عجیب ماچس ہے اور پھر اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ نہ جانے یہ سلسلہ کب ختم ہوا لیکن مجھے اس کی یہ ادا بھلی لگی۔ میری مصنوعی زندگی جو میں نے سال ہا سال دفتری ماحول میں بسر کی ہے اس بے ساختہ پن سے خالی ہے کہ ایک عجیب و غریب قسم کی ڈبیہ طبیعت میں گدگدی کا احساس پیدا کر دے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں سچ مچ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔

ایک ریاست کے دار الحکومت کا ذکر ہے۔ جاں نثار وہاں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے۔ میں بھی اس مشاعرے میں مدعو تھا۔ مشاعرے کے منتظم میرے اور جاں نثار کے ایک عزیز دوست تھے اور بہت بڑے افسر تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن انھوں نے جاں نثار سے اور مجھ سے کہا کہ چلیے آپ کو فلاں بڑے آدمی سے ملوا لائیں۔ خدا جانے جاں نثار کا اس ملاقات کو جی چاہتا تھا یا نہیں ـــ غالباً نہیں ـــ لیکن اپنے دوست کی دل جوئی کے لیے ان کے ساتھ چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو وہ صاحب بڑے اخلاص سے پیش آئے۔ ہمارے دوست نے کہا کہ جاں نثار اختر آپ سے ملنے کے بڑے خواہش مند تھے۔ اس سے قبل کہ میزبان کچھ کہتے جاں نثار نے چھوٹتے ہی کہا جی ہاں میں نے سوچا جب یہاں تک آگئے ہیں تو آپ سے بھی ملتے چلیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ فقرہ صاحبِ خانہ کے سر کے اوپر سے گزر گیا ورنہ شاید رنگِ محفل ہی بدل جاتا۔

یہ اس بے نیاز شاعر کی زندگی کا دوسرا بے تکلف پہلو تھا۔

ایک ملاقات میں جاں نثار نے مجھ سے گلہ کیا کہ میں نے کشمیر آج تک نہیں دیکھا۔ میں یہ سن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں تو مشاعروں کا وہ طوفان برپا ہے کہ ان میں تیسرے درجے تک کے شعرا بھی آچکے ہیں۔ جاں نثار نے جواب دیا شاید میں چوتھے درجے کا شاعر ہوں۔

یہ بات کئی برس ہوئے دلی میں ہوئی تھی۔ میں سری نگر واپس آیا تو ایک مشاعرے کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ منتظمین نے ازراہِ عنایت فہرست شعرا مجھے دکھائی۔ میں نے کہا کہ فہرست یوں تو ٹھیک ہے لیکن اس میں ایک نام کی کمی ہے اور وہ ہے جاں نثار اختر کی۔ جواب ملا کہ صادق صاحب (مرحوم) اس فہرست کو منظور کر چکے ہیں اور اب اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ صادق صاحب ان دنوں علیل تھے اور ڈاچی گام کے بنگلے میں محوِ آرام تھے۔ میں وقت لے کر ان کے پاس پہنچا۔ مقصدِ ملاقات محض فہرستِ شعرا میں ایک نام کا اضافہ کرنا تھا۔

جب میں نے انھیں بتایا کہ جاں نثار نے آج تک کشمیر نہیں دیکھا تو انھیں تعجب ہوا۔ پھر بولے آپ لوگوں میں گروہ بندیاں بھی تو ہیں، اس لیے ان کا نام کٹ جاتا ہوگا۔ اب کے انھیں ضرور بلوائیے۔

میں نے واپس پہنچتے ہی منتظمین کو صادق صاحب مرحوم کی منظوری سے مطلع کیا لیکن خدا جانے کیا ہوا فنڈ کم پڑے یا کوئی اور بات ہو گئی۔ وہ مشاعرہ منعقد ہی نہ ہو سکا اور اپنی جھینپ مٹانے کا جو موقع مجھے مل رہا تھا وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ صورت حال آج تک ویسی ہی ہے کہ جاں نثار اختر کشمیر کبھی نہیں آئے۔

جاں نثار کا شرمیلا پن بھی اپنی مثال آپ ہے۔ غالباً ۷۳ء کی بات ہے مجھے جاں نثار نے بمبئی کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ میں سری نگر سے ابھی دہلی پہنچا ہی تھا کہ فضائی مستقر پر چیف سکریٹری جموں و کشمیر کا پیغام ملا اور وہ یہ تھا کہ کل یہاں ایک اہم میٹنگ ہے بمبئی نہ جاؤ بلکہ دہلی ہی سے سری نگر واپس آجاؤ۔ سرکاری فرائض کو مشاعروں پر ترجیح دینا تو ایک سرکاری ملازم کے لیے اشد ضروری ہے چنانچہ میں انھی قدموں سری نگر واپس لوٹ آیا لیکن طبیعت بے حد منغض ہوئی۔ ایک تو بمبئی کا مشاعرہ ہاتھ سے گیا۔ ساتھ ہی بمبئی کے تمام دوستوں سے ملاقات جس کے شوق میں میں بمبئی جا رہا تھا، صورت پذیر ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی اور تیسرا سری نگر سے دہلی اور دہلی سے سری نگر کا طیارے کا کرایہ اپنی جیب سے دینا پڑا۔ اس نقصان مایہ کے ساتھ بقول

شیخ سعدیؒ شماتتِ ہمسایہ الگ۔ میں نے سری نگر سے بڑی بے تکلفی کے عالم میں جاں نثار کو ایک خط لکھا کہ خیال تھا کہ چند روز اکٹھے بڑے مزے میں گزریں گے۔ اس کی جگہ اب ایک بے لطفی نے لے لی ہے لیکن جاں نثار کی بھی اس میں کیا خطا تھی۔ وہ تو میری اپنی مجبوری تھی۔ جاں نثار نے لکھا کہ آئندہ برس پھر مشاعرہ ہوگا اس کی تلافی کر دی جائے گی لیکن آئندہ برس کسی وجہ سے جاں نثار مجھے نہ بلا سکے۔ اب جو دہلی میں دو ایک مشاعروں میں ہم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں تو جاں نثار منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ گویا مجھے مشاعرے میں مدعو کرنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا اور اس فرض سے کوتاہی ناقابلِ معافی جرم تھی۔

چند روز بعد انھیں دو ایک خطوط لکھے۔ مدت کے بعد جواب ملا۔

"پیارے آزاد! تمھارا خط ملا تھا۔ جواب میں نے اس لئے نہیں دیا کہ تمھیں اس سال دادا بھائی فضل بھائی ٹرسٹ کے مشاعرے میں مدعو نہیں کیا تھا۔ اس کی تھوڑی سی شرمندگی تھی ...."

سبحان اللہ! زمانہ کہاں نکل گیا اور اس زمانے میں ایک جدید شاعر کس قدر "پرانی اقدار" کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔

(۲)

یہی خلوص، یہی صداقت احساس جاں نثار کی شاعری میں بھی جھلک رہی ہے۔ دراصل اس کی شاعری اس کی زندگی سے الگ تھلگ ہوا میں معلق کوئی شغل وقتی نہیں ہے اس کی زندگی کا اظہار ہے۔ اس کی شخصیت کا پرتو ہے۔

یہ شاعری دو ادوار میں منقسم ہے۔ ایک ترقی پسند شاعری کا دور جس کے بارے میں ان سطور کی ابتدا میں کہا جا چکا ہے کہ اس وقت بھی جاں نثار کی آواز باقی شعراء کی آوازوں سے مختلف تھی۔ جو خاصیت شعر اس دور میں جاں نثار کو اپنے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے اس کے کلام میں عصری حسیت کا شعور۔ ۳۵ء سے ۵۵ء تک کی ترقی پسند شاعری میں عصری دور کی تصویر کشی کی کوشش تو کی گئی ہے لیکن اس شاعری میں بحیثیت مجموعی عصری حسیت کا فقدان ہے۔ جاں نثار کی اس دور کی شاعری اس خلا کو بڑی حد تک پر کر رہی ہے۔

جاں نثار کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں شاعر نے از سرِ نو اپنی دریافت کی ہے اس دور کی مدت بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ چند ہی برس ہوئے شروع ہوا ہے۔ اس دور میں شاعر

کے تجربے کی وسعت، گہرائی اور گیرائی جس طرح جذبے میں تحلیل ہوئی ہے وہ ہماری اردو شاعری کا بالکل ہی ایک نیا اور اچھوتا باب ہے۔

اس دور میں اختر عصری حسیت کے شعور کی منزل سے اور آگے قدم بڑھا کے انکشافِ ذات کی منزل تک آیا ہے اور اس انکشاف ذات نے اس فاصلہ کو کم کیا ہے جو ہماری شاعری اور ہماری حقیقی اور سچی زندگی ہمیں "گھر آنگن" میں نظر آتی ہے۔

جاں نثار اختر سے پہلے فراق کی رباعیات میں "گھر آنگن" تو نہیں لیکن گھر آنگن کی تلاش ضرور ملتی ہے۔ مگر یہ موضوع فراق کا موضوع نہ بن سکا۔ اسے جان نثار اختر کا موضوع بننا تھا۔

کرشن چندر نے "گھر آنگن" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "فراق اس کے لیے قصور وار نہیں ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی اس کی ذمہ دار ہے جس کا اعتراف انھوں نے بارہا کیا ہے۔" دراصل یہ قصور وار یا بے قصور ہونے کی بات نہیں ہے۔ شاعر کی LIMITATION کی بات ہے۔

یہاں کرشن چندر ایک اہم نکتے کو فراموش کر رہے ہیں۔ شاعری فوٹوگرافی نہیں ہے۔ فراق کے "گھر آنگن" کے موضوع تک نہ پہنچنے کا سبب ان کی گھریلو زندگی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ فراق متنوع موضوعات کا شاعر نہیں ہے۔ فراق کی رباعیات فراق کی غزل ہی کا ایک دوسرا روپ ہیں۔ فراق کی زیادہ تر نظمیں سپاٹ اور شعریت سے معرا ہیں۔ صرف انھی نظموں میں فراق ایک کامیاب شاعر نظر آتا ہے جو فراق کے محدود غزلیہ موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ہاں غزل کے روایتی موضوع حسن وعشق کو فراق نے جو ایک جدت اور ندرت عطا کی ہے وہ ایک کارنامہ ہے۔ ان حدود کے باہر اول تو فراق نے کچھ کہا ہی نہیں اور جو کچھ کہا ہے وہ درجہ اول کی تخلیق نہیں۔ جہاں تک ہمہ گیریت (VERSATILITY) کا تعلق ہے جاں نثار اختر کا مقام فراق سے کہیں بلند ہے۔

گھریلو زندگی والی بات اپنی جگہ جیسی ہے سو ہے لیکن اگر فراق غزل کے محدود موضوع سے باہر جانے کی صلاحیت رکھتے تو ان کی اس تلخ گھریلو زندگی کا ردعمل خوش گوار گھریلو زندگی کی شاعری میں ظاہر ہوتا لیکن فراق اپنی تمام تر ذہانت اور علمیت کے باوجود اس شاعرانہ ردعمل کی لذت سے ناآشنا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں "نتھرے ہوئے پانیوں میں خوابیدہ رنگوں کو گھلا دینے کی کاوش" تو ملتی ہے لیکن زندگی کو انتہائی قریب سے دیکھنے کے باوجود زندگی کی جانب اتنا شدید ردِعمل نہیں ملتا جس کی ایک حساس شاعر سے توقع کی جاتی ہے۔

دراصل فراق کی شاعری کا المیہ یہ ہے کہ آج ہمارے نقاد فراق کی شاعری سے اتنا متاثر نہیں جتنا ان کی مقبولیت سے متاثر ہیں۔ اور اس مقبولیت میں فراق کی شاعری کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا ان کی ذہانت اور عالمانہ گفتگو کا۔ لیکن یہ گفتگو ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ انجام کار شاعری کو معیارِ نقد بننا ہے۔ اور شاعری جب معیارِ نقد بنے گی تو اسے خالص ادبی اقدار سے ناپنا ہوگا۔ فراق کے ادب کو غیر ادبی پیمانے سے ناپنے کا طریقہ فراق کی گفتگو اور محفل آرائی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔

اختر کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انکشافِ ذات کے جس عمل کا میں نے ذکر کیا ہے وہ کوئی میکانیکی عمل نہیں ہے بلکہ ایک وجدانی عمل ہے اور "گھر آنگن" کی شاعری اسی وجدانی عمل کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس سے الگ نہیں اور یہ ہمیں اختر کی غزل میں نظر آتا ہے۔

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے — یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے
جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے — بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے
نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے — کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

یہ دونوں پہلو ایک شخصیت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ مکمل شخصیت کا مطالعہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

دراصل اردو شاعری فرد کی عام معمولی روزمرہ کی زندگی سے اپنا تعلق کچھ اس طرح توڑ چکی ہے کہ اس احساسِ زیاں سے بھی بیگانہ ہو گئی ہے۔ جی۔ ایس فریزر کے الفاظ میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ جو شاعری روزمرہ کی عام اور معمولی زندگی سے بیگانہ ہو جائے وہ ممکن ہے "بڑے موضوعات" کے ساتھ بھی انصاف نہ کر سکے۔

جاں نثار اختر نے ایک عام انسان کی عام اور ہر روز بسر ہونے والی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی تمام تلخیوں، ناکامیوں، محرومیوں اور شکستوں کو جو عصرِ حاضر کی دین ہیں اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ زہر پینے کا یہ عمل اس وقت تک نامکمل ہے جب تک یہ زہر شاعر کی فکر میں آ کر امرت کی صورت اختیار نہ کرے۔ جاں نثار کی شاعری اسی زہر کے امرت میں تبدیل ہونے کا ایک عمل ہے۔

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے — ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

تشنگی کچھ تو بجھے تشنہ لبانِ غم کی　　اک ندی درد کی شہروں میں بہادی جائے
ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا　　کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

لوگ خاموش سے کیوں ہیں　　ایسی کیا آن پڑی ہے
زندگی ہاتھ پسارے　　آج رستے پہ کھڑی ہے
کبھی ایسا بھی لگا ہے　　زندگی بند گھڑی ہے

یہ حقائق کی چٹانوں سے تراشی دنیا　　اوڑھ لیتی ہے طلسموں کی ردا رات گئے
دن کے ہنگاموں میں کیا کوئی کسک ہو محسوس　　دل کی ہر چوٹ کا چلتا ہے پتا رات گئے
بھیگی بھیگی ہوئی موسم کی ہواؤں پہ رچا　　دل پہ برسے گی شراروں کی گھٹا رات گئے

(۳)

مندرجہ بالا مقالہ جاں نثار کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور "فن اور شخصیت" بمبئی کے جاں نثار اختر نمبر میں شائع ہوا۔

ذیل کی سطور تحریر کی ذیل میں نہیں بلکہ تقریر کی ذیل میں آتی ہیں۔ یہ تقریر ۱۹ اگست ۷۶ء کو اختر کی موت کے تھوڑی دیر بعد اُن کی یاد میں ایک ہدیۂ عقیدت کے طور پر سری نگر ریڈیو سے کی گئی اور ٹیپ سے نقل کرنے کے بعد بغیر کسی تبدیلی کے یہاں درج کی جا رہی ہے۔

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی

آج جاں نثار اختر بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ابھی کچھ مدت قبل جب بمبئی میں میری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ محبوب دوست اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائے گا۔ اس کے قہقہے آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

بعد میں جاں نثار کے بھوپال جانے اور بیمار ہونے کی اطلاع تو ہم تک پہنچی لیکن جو کچھ آج ہو گیا ہے اس کا تو سان گمان ہی نہ تھا۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آج دوپہر کی ڈاک میں "فن اور شخصیت" کا جاں نثار اختر نمبر مجھے ملا۔ میں ابھی اس کا ریپر کھول ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کے اس کے انتقال کی خبر دی۔ میری سمجھ میں بات

نہ آئی کہ بتانے والے کے منہ سے اس نمبر کو دیکھ کے غلطی سے جاں نثار کا نام نکلا ہے یا خدا جانے معاملہ کیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا۔ خبر صحیح ہے اور جاں نثار اختر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا ہے۔

اس وقت جب کہ میرے اس کے ساتھ تیس برس کے تعلقات ایک چلتی ہوئی فلم کی طرح میری نظر کے سامنے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس حادثۂ جانکاہ کے متعلق کیا کہوں۔ اس کی دل کش شاعری کا ذکر کروں، نظم کا، غزل کا، یا رباعیات کا، یا اس کی محبوب شخصیت کا۔ یہ خلا جو اس کی موت سے پیدا ہوا ہے نہ صرف شعروادب ہی کی دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے، صرف اردو دنیا ہی میں پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ دلوں کی دنیا میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ جاں نثار کی شاعری کی طرح اس کی شخصیت بھی دل کشی سے لبریز تھی۔ اس کی شاعری کی طرح اس کی شخصیت بھی محبوبیت کا ایک انداز لیے ہوئے تھی۔

جاں نثار اختر کی شاعری پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ "سلاسل" سے "خاکِ دل" اور "خاکِ دل" سے "گھر آنگن" تک کی شاعری پر بات کا یہ محل نہیں۔ اس وقت تو اپنے محبوب دوست کی یاد میں آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرنے کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ سوائے اس شعر کے جو جاں نثار ہی کے ایک شعر کی تبدیل شدہ صورت ہے ؎

ہم سے کیوں بھاگ گئے دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا تھا تمھیں چاہنے والوں کی طرح

نریش کمار شاد

ایک تاثر

سری نگر

۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء

محترمی خوشتر صاحب تسلیم

"بیسویں صدی" میں نریش کمار شاد کے متعلق آپ کی تحریر پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرے تو وہم و گمان میں کبھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ یارِ عزیز اس قدر جلد ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے گا اور میری دلی کیفیت تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اس کے مرنے کا یقین نہیں آرہا ہے۔

آپ کا شاد پر ہمیشہ دست شفقت رہا لیکن اس کی شراب نوشی کو آپ بھی نہ روک سکے۔ یہ اردو ادب کی بد قسمتی ہے۔ اختر شیرانی، مجاز، مجید لاہوری اور منٹو یہ سب اسی کثرتِ شراب نوشی کے شکار ہوئے۔ اب اس فہرست میں جدید ترین نام نریش کمار شاد کا ہے۔ خدا جانے یہ ام الخبائث اور کس کس نابغے کو ہم سے چھین کر لے جائے گی۔

میں ابھی تک اس مرحوم دوست کے بارے میں نظم یا نثر میں کچھ نہیں لکھ سکا ہوں۔ صدمے کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانا ابھی تک دشوار معلوم ہو رہا ہے لیکن میں لکھوں گا ضرور اور جو کچھ لکھوں گا وہ آپ ہی کے لیے ہوگا۔

خوشتر صاحب محترم، غالباً یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ میرے اس کے پچیس برس کے

تعلقات تھے اور ۱۹۴۷ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب آپ گرمیوں میں پہاڑ پر تھے تو میں نے اور نریش کمار شاد نے کچھ دن اکٹھے "بیسویں صدی" کے دفتر (بیرون شاہ عالمی دروازہ لاہور) میں بسر کیے تھے۔ کیونکہ جن علاقوں میں ہم لوگ رہتے تھے وہ بری طرح سے فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں تھے اور "بیسویں صدی" کے دفتر ہی میں ہمیں جائے سکون نظر آئی تھی۔

میرے اور شاد کے پچیس برس کے مراسم دوستانہ بھی رہے اور دشمنانہ بھی۔ اس مدت میں ہم نے دوستی بھی نباہی اور دشمنی بھی نباہی۔ اسی مارچ میں اس سے جموں میں آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے مشاعرے میں اس کا بڑے اچھے لفظوں میں تعارف کرایا تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے اگلے دن اچھی طرح سے نہ ملا۔ شاید اس لیے کہ میں نے ذاتی طور پر جموں میں اس کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں بھی جواباً اسی بے اعتنائی سے پیش آیا لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ دوستی دشمنی کے تمام معاملات طے کر لوں گا لیکن اس نے تو ۲۲ جون تک انتظار بھی نہ کیا اور مجھ سے تو کیا سارے زمانے سے خفا ہو کے چلا گیا۔

شاد ایک ایسا فن کار تھا جس نے دنیا کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا تھا اور اپنی احتیاج کے باوجود دنیا سے اس نے نفرت کی تھی۔ شدید نفرت ——— اس نے کسی کو اپنا دوست نہیں سمجھا تھا۔ اور اس کا کوئی دوست تھا بھی نہیں۔ اس نے محبت بھی کی، عشق بھی کیا لیکن اس کا یہ عشق نفرت کی بنیادوں پر استوار ہوا ——— اور ظالم نے خودکشی بھی کی کس وقت؟ رات کے دو بجے ـــ اور جمنا میں چھلانگ لگا کے تاکہ جس دنیا سے اس نے ہمیشہ نفرت کی ہے اسے پتہ بھی نہ چلے اور وہ دنیا سے دور چلا جائے۔ صبح کو اس کی لاش ملی۔ کہتے ہیں کہ پہچاننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ پولیس کے ایک سپاہی نے پہچانا ـــ اور پوسٹ مارٹم کے بعد جب ارتھی چلی تو ساتھ کون لوگ تھے۔ صرف وہ دو شخص جن کے بارے میں شاد کی زبان پر کبھی کلمۂ خیر نہیں آیا تھا ——— محمود ہاشمی اور بلراج مینرا۔

محمود ہاشمی نے مجھے لکھنؤ میں بتایا کہ شمشان بھومی میں اس شخص کو جس کا کام مردوں کو جلانا ہے جب یہ معلوم ہوا کہ یہ نریش کمار شاد تھا تو اس نے کہا کہ یہ تو میرے پاس بھی اکثر آیا کرتا تھا مجھے اپنا کلام سناتا تھا اور مجھ سے شراب کے لیے روپیہ لے جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے محمود ہاشمی اور بلراج مینرا سے شمشان بھومی کے اخراجات لینے سے انکار کر دیا! آخر شاعر کو ایک قدر دان تو ملا۔ زندگی کے بعد ہی سہی۔ ہر فن کار کو موت کے بعد بھی قدر دان کہاں ملتا ہے۔

حسرتِ موہانی

مولانا حسرت موہانی کے ساتھ میری ملاقاتوں کی تعداد تو کم نہیں رہی لیکن ان ملاقاتوں کو فوراً ضبطِ تحریر میں نہ لانے کی کوتاہی جو مجھ سے ہوئی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج اگر میں یہ داستان آپ کو سنانا چاہوں تو تاریخوں کی غلطیاں ضرور اس داستان میں در آئیں گی اور ہو سکتا ہے کہ واقعات بھی آپس میں گڈمڈ ہو جائیں لیکن اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ آج کی تقریب کے بہانے[1] یہ چند واقعات محفوظ ہو جائیں۔ تاریخوں کی اول تو اس داستان میں زیادہ اہمیت نہیں ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو اُن کی تصحیح کی بعد میں کوشش کی جا سکتی ہے۔

مولانا کو سب سے پہلے میں نے راولپنڈی میں دیکھا۔ ایک مشاعرے میں یہ غالباً ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس مشاعرے کا انتظام عبدالعزیز فطرت مرحوم نے کیا تھا۔ معلوم نہیں حسرت صاحب کسی کام کے سلسلے میں پہلے ہی سے راولپنڈی میں موجود تھے یا اس مشاعرے کے لیے انھوں نے خاص طور سے زحمت کی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ شعرا ڈائس پر نہیں تھے بلکہ سامنے سامعین کی پہلی دو تین صفوں میں کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ والد محترم کے ساتھ کی کرسی پر حسرت مرحوم بیٹھے تھے۔ احسان دانش، پنڈت ہری چند اختر، عبدالحمید عدم اور

---

[1] ۱۳ مئی ۱۹۷۸ء کو کان پور میں فورتھ فریڈم فورم کے زیرِ اہتمام یومِ حسرت موہانی منایا گیا۔ دن میں سیمینار اور رات کو مشاعرہ۔ اس سیمینار کے دو خاص پروگرام تھے۔ یہ مقالہ اسی موقع پر لکھا گیا اور سیمینار میں پڑھا گیا۔

عطاء اللہ کلیم بھی پہلی صف میں تھے۔ راقم التحریر فضل الرحمٰن رشک اور چند اور نئے شعراء ان کے پیچھے دوسری صف میں تھے۔

مجھے چوں کہ اسی وقت مشاعرے سے اٹھ کر دس بجے رات کی ریل سے لاہور آنا تھا جہاں میں زیر تعلیم تھا اس لیے بار بار میں گھڑی کو دیکھ رہا تھا اور مشاعرے میں میرا جی نہیں لگ رہا تھا لیکن میں حسرت مرحوم کو سنے بغیر اٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وقت کی تنگی کے باوجود مشاعرے میں میری شمولیت کا ایک بڑا سبب حسرت مرحوم کو سننا تھا۔

اس روز گرمی بہت شدید تھی۔ بجلی کے پنکھے کبھی چلتے تھے کبھی بند ہوتے تھے۔ سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ ہال میں بیٹھنا دشوار تھا۔ اور سب لوگ حسرت موہانی کو سننے کے لیے آئے تھے۔ لیکن اس زمانے کے آداب مشاعرہ کے مطابق حسرت صاحب کو تو آخر ہی میں زحمت دی جاسکتی تھی اور مشکل یہ تھی کہ سامعین کسی اور شاعر کا کلام سننے پر آمادہ نہ تھے۔

آخر طے پایا کہ حسرت صاحب کو زحمت دی جائے۔ احسان دانش نے مصلحتاً کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پہلے میں پڑھوں گا اور حسرت صاحب میرے بعد پڑھیں گے۔ چنانچہ احسان دانش کا نام پکارا گیا۔ احسان نے کلام شروع کیا۔ ہال داد و تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔ سارے مشاعرے کی فضا ہی بدل گئی۔

اب اس کے بعد حسرت صاحب کو زحمت دی گئی۔ انھوں نے بھی ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے یاد نہیں انھوں نے کون سی غزل شروع کی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ ان کی آواز گلے سے کم اور ناک سے زیادہ نکل رہی تھی۔ ترنم کیا تھا بس جیسے معصوم بچہ گانے کی کوشش کر رہا ہو۔ سامعین کچھ دیر تو احتراماً سنتے رہے پھر ہال میں ایک طرف طلبہ کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ کھانسی تو آپ جانتے ہیں۔ مشاعرے میں متعدی بیماری کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف باتیں شروع ہوگئیں۔ منتظمین نے سامعین کو بہت سمجھایا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ حسرت صاحب نے دوسری اور پھر تیسری غزل شروع کی لیکن نہ چل سکے۔ ڈائس سے نیچے اتر آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

یہ تھا حسرت صاحب کا پہلا دیدار جو مجھے حاصل ہوا۔ اب میں اسے ملاقات تو نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ بھی تھا اس کا ایک یادگار پہلو یہ تھا کہ میں ساری صورت حال سے بہت مایوس ہوا۔ حسرت صاحب نے اپنا کلام ختم کیا اور میں نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ ممکن ہے میں اسی دن لاہور روانہ نہ ہوجاتا تو دوسرے دن حسرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

اس کے دو ایک برس بعد لاہور میں پھر حسرت صاحب کو سننے کا موقع ملا۔ مولانا صلاح الدین احمد مدیر "ادبی دنیا" نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک عجیب و غریب جلاس کا اہتمام کیا تھا۔[1] اجلاس کی صدارت حکیم احمد شجاع نے کی۔ پروگرام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی ابتداء اقبال اور حسرت کی غزلوں سے ہوئی۔ اقبال کی غزل تھی :-

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

اور حسرت کی :-

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اقبال کی غزل پیش کرنے کی سعادت مجھے ملی تھی اور حسرت موہانی کی غزل میرے ایک دوست نے پیش کی جس کا نام اقبال حسین تھا اور جو آج اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد حسرت کی شاعری پر مولانا صلاح الدین احمد، حکیم احمد شجاع، سید عابد علی عابد اور بعض اور حضرات نے تقریریں کیں۔ آخر میں حسرت صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ اپنا کلام ارشاد فرمائیں۔ اس واقعے کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مجھے حسرت صاحب کے الفاظ تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ انھوں نے غزل کی تین قسمیں بیان کیں۔ صوفیانہ، عاشقانہ اور فاسقانہ۔ یہ اقسام بیان کرنے کے بعد آپ نے کہا۔ اب میں ان اقسام کے پیش نظر اپنا کلام آپ کو سناؤں گا۔ ایک نہایت عمدہ بات اس محفل میں، انھوں نے یہ کی کہ اپنا کلام ترنم سے پیش نہیں کیا۔ تحت اللفظ ہی پڑھا ورنہ ممکن تھا کہ راولپنڈی والی کیفیت یہاں بھی پیدا ہو جاتی۔ جب آپ صوفیانہ اور عاشقانہ موضوعات پر اپنا کلام سنا کے رخصت ہونے لگے تو آوازیں آئیں "فاسقانہ، فاسقانہ" چنانچہ آپ نے یہ اشعار سنانا شروع کیے۔

رشک سے مٹ مٹ گئے ہم تشنہ کامانِ وصال
جب ملا لب ہائے ساقی سے لب پیمانہ آج

کہتا ہے عجب ناز سے اٹھلا کے یہ وہ شوخ
حسرت سے تو پردہ نہ کیا ہے نہ کریں گے

دل خون ہوئے جاتے ہیں اربابِ نظر کے
رکھتی ہے قیامت کا تری سرخیِ لب رنگ

---

[1] آج کل تو ایسے اجلاس عام ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں یہ اپنی وضع کا ایک انوکھا اجلاس تھا۔

اس پر ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر باوازِ بلند کہا "مولانا! یہ تو عاشقانہ شاعری ہے۔ ہمیں آپ سچ مچ کی فاسقانہ شاعری سنائیے۔ یہ بتائیے اٹلی میں آپ کیا کرتے رہے" ساتھ ہی ایک اور آواز آئی — مولانا وہ سنائیے۔

وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اتنے میں ایک اور نوجوان نے پکارا "مولانا وہ ہمیں اٹلی کی زوپا کے بارے میں کچھ سنائیے" مولانا نے فوراً جواب دیا "وہ عاشقانہ باتیں ہیں فاسقانہ نہیں" اس برجستہ جواب پر ساری محفل قہقہہ زار بن گئی۔

ظاہر ہے کہ مولانا کے ساتھ یہ کبھی میری ملاقات نہیں کہی جا سکتی۔ یہاں بھی میرا حصہ دور کا جلوہ ہی رہا۔ ملاقاتیں ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئیں۔ جب تقسیم ہند کے بعد ہم لوگوں نے راولپنڈی اور لاہور کو چھوڑ کر دہلی کو اپنا وطن بنایا۔

دہلی میں حسرت صاحب کا مسکن تو اس مسجد کا حجرہ تھا جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے واقع ہے اور جس کے قریب آج سابق صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد کی آخری آرام گاہ ہے۔ لیکن حسرت صاحب اکثر ہر شام اردو بازار آتے تھے۔ اور مولوی سمیع اللہ مرحوم کی دکان پر اپنی محفل سجاتے تھے۔ اصل میں مولوی سمیع اللہ کی دکان ہندوستان کے ہر حصے سے آنے والے اہلِ اردو کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ سمیع اللہ مرحوم سخن فہم تھے۔ شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ چائے کا دور ان کی دکان پر جس کا نام کتب خانہ عزیزیہ ہے صبح سے شام تک چلتا تھا اور جب تک مولوی سمیع اللہ زندہ رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔

اسی دکان پر حسرت صاحب کی گل افشانیِ گفتار سے فیض یاب ہونے کے مواقع مجھے اکثر میسر آئے۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا "مولانا! یہ نظم معرا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جب پابند شاعری میں ہر طرح کا خیال ادا ہو سکتا ہے تو نظم معرا کی کیا ضرورت ہے"۔ دراصل اس سوال کا مقصد اس صنفِ سخن کے متعلق حسرت صاحب کے خیالات جاننا تھا۔ میں نے محض انھیں PROVOKE کرنے کے لیے اس صنفِ سخن کے بلا ضرورت ہونے کی طرف اشارہ کیا ورنہ دراصل میں خود پابند شاعری کے ساتھ ہی ساتھ اپنے اظہار خیال کے لیے نظمِ آزاد اور نظمِ معرا دونوں کا انتخاب ۱۹۳۷ء ہی سے کر چکا تھا۔ کہنے لگے معرا شاعری کوئی نئی صنف سخن نہیں ہے۔ غزل کا ہر شعر مطلعے کو چھوڑ کر اپنی الگ حیثیت سے معرا شاعری کی مثال ہے۔ جب غزل کے اشعار پر

آپ اعتراض نہیں کرتے تو معترض شاعری پر کیوں معترض ہوتے ہیں۔ محفل میں جس قدر لوگ موجود تھے سب نے اس نکتے کی داد دی۔ بات اگرچہ سامنے کی تھی لیکن اس پر ہم لوگوں کی نگاہ اس وقت گئی جب حسرت صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا۔

نئی دہلی کی جس مسجد کے حجرے کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں حسرت صاحب مرحوم کا نیاز حاصل کرنے کے لیے مجھے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ زمین پر ایک چٹائی بچھی رہتی تھی یا بوریا۔ یہی اس فقیر کی کائنات تھی۔ اسی پر بیٹھ کر وہ آسمانِ فکر کی ان بلندیوں کو چھوتے تھے جنھوں نے اردو شاعری کی رفعتوں میں اضافہ کیا۔ ایک چھینکا چھت سے لٹکا رہتا تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر سوکھی روٹی رکھی رہتی تھی۔ آپ گئے میں گیا حسرت صاحب نے بلا تکلف ہر ایک کو اس دعوتِ شیراز میں شریک کرنا چاہا۔ مجھے اس دعوتِ شیراز میں شریک ہونے کی سعادت دو ایک بار حاصل ہوئی۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اس باطن کے غنی اور ظاہر کے فقیر کی فقیری کی داستانیں تو بہت ہیں لیکن میں یہاں آپ کو دو ایک ہی سناؤں گا۔

ایک بار حسرت صاحب کے ساتھ ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ مشاعرے کے بعد بالعموم ہم شعرا کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ ہم قریب قریب کاسۂ گدائی بن جاتے ہیں۔ مشاعرے کے بعد اکثر شعرا کی نظر منتظمین پر ہوتی ہے کہ کب وہ آ کر اپنا موعودہ زرِ خطیر شعرا کی نظر کرتے ہیں لیکن یہ ذکر ایک مختلف قسم کے مشاعرے کا ہے جس کے خاتمے کے بعد منتظمین مشاعرہ بڑے احترام کے ساتھ شعرا کی خدمت میں موعودہ معاوضہ پیش کر رہے تھے۔ جن شعرا نے معاوضے کی رقم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ان سے منتظمین اخراجاتِ سفر کے متعلق پوچھ پوچھ کے روپیہ ادا کر رہے تھے۔ حسرت موہانی انھی شعرا میں سے تھے جنھوں نے شرکت مشاعرہ کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ منتظمین نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کے ایک لفافہ انھیں پیش کیا۔ آپ نے فوراً کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سفر میں کچھ خرچ نہیں کیا۔ ایک گارڈ مجھے اپنے ساتھ اپنے ڈبے میں بٹھا کے لے آیا ہے۔ ٹکٹ میں نے خریدا ہی نہیں۔ وہ گارڈ آج شام کو واپس جا رہا ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ منتظمین نے بہت کہا حضور آپ یہ حقیر سا نذرانہ ہماری طرف سے قبول کر لیجیے لیکن حسرت صاحب اس قطعی جواب کے ساتھ اپنے انکار پر اڑے رہے کہ جب میں نے ریل کے ٹکٹ وغیرہ پر کچھ خرچ ہی نہیں کیا تو آپ سے

اخراجاتِ سفر یا معاوضہ لینے کا کیا سوال۔

سر سلطان احمد مرحوم کے ۔ٹی ۔ کے سی ایس آئی حکومتِ ہند کے ممبر تھے۔ انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کا محکمہ ان کے پاس تھا۔ تقسیم ہند سے قبل حکومت ہند کے ممبروں کا وہی درجہ تھا جو آج کیبنٹ منسٹر کا ہے۔ اختیارات کہیں زیادہ تھے۔ کیونکہ وہ جمہوری دور نہیں تھا۔ مشاعرے کے دوسرے دن انھی سر سلطان نے تمام شعرا کو ڈنر کی دعوت دی۔ شعراء اور حکومتِ ہند کے بعض ممبر جن میں مجھے اس وقت صرف سر جگدیش پرشاد سری واستو[1] اور مسٹر غلام محمد کے نام یاد ہیں اور حکومتِ ہند کے بڑے بڑے افسر وقتِ مقررہ پر سر سلطان کی کوٹھی پر موجود ہیں۔ حسرت صاحب ایک طرف اپنے جھولے میں سے اخبار نکال کر اسی بوسیدہ عینک کی مدد سے پڑھ رہے ہیں۔ جس کے ایک طرف کمانی ٹوٹ جانے کے باعث انھوں نے اس کی جگہ دھاگا باندھ رکھا ہے۔ کھانا میز پر چنا جا چکا ہے اور سر سلطان تمام شعراء سے "از راہ ذرّہ نوازی" ڈائننگ ہال میں تشریف لانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اسی وضع داری کے عالم میں وہ حسرت صاحب کے پاس پہنچتے ہیں اور دست بستہ عرض کرتے ہیں حضور کھانا حاضر ہے۔ تشریف لائیے۔ حسرت موہانی اخبار سے آنکھ اٹھا کے سر سلطان کی طرف دیکھتے ہیں اور جواب دیتے ہیں "کھانا ہم کھا آئے"۔ سر سلطان کہتے ہیں حضور کھانا تو آپ کو یہیں تناول فرمانا تھا۔ حسرت بڑی بے اعتنائی سے جواب دیتے ہیں "ہم جہاں ٹھہرے ہیں کھانا ہم نے وہیں کھا لیا تھا"۔ سر سلطان درخواست کرتے ہیں حضور تھوڑی دیر کے لیے ڈائننگ روم میں تشریف لے چلیے ذرا سا میٹھا ہی چکھ لیجیے۔ جواب ملتا ہے "ہم یہاں بہت آرام سے بیٹھے ہیں۔ ہم کھانا کھا آئے۔ اب ہم کچھ نہیں کھائیں گے"۔

اس دورِ شکم پرور میں یہ شان بے نیازی رشیوں، منیوں اور درویشوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

والد محترم ویجی ٹیرین تھے اس دعوت میں انھیں شاید میز پر ویجی ٹیرین کھانا نظر نہیں آیا، یا انھوں نے ویجی ٹیرین کھانوں کو بھی شاید نان ویجی ٹیرین سمجھا۔ وہ دہی کے دو ایک چمچوں سے اپنی بھوک مٹا کر جلدی سے باہر آ گئے اور ایک کرسی لے کے حسرت موہانی کے پاس بیٹھ گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان دونوں شاعروں میں کیا باتیں ہوئیں لیکن اتنا یاد ہے کہ والد نے جب تھوڑی دیر بعد ہونے والی

---

[1] یہ وہی جگدیش پرشاد سری واستو ہیں جن کے متعلق مشہور غزل گو شاعر رفیع احمد خاں کا یہ شعر ایک زمانے میں زبان زدِ خاص و عام رہا۔

بڑا ہی کرم ہے سری واستو کا

- - - - - - - - -

نشست کے لیے غزل منتخب کرنے کے لیے اپنی بیاض نکالی تو حسرت صاحب نے ان سے بیاض لے لی اور بہت دیر تک اس بیاض کو پڑھتے رہے۔ ممکن ہے اس کا سبب وہ غزل ہو جو والد نے گزشتہ رات مشاعرے میں پڑھی تھی اور جس میں حسرت صاحب نے ان کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ اس غزل کا ذکر میں اس مقالے میں تھوڑی دیر بعد کروں گا۔ اس سے قبل آپ ایک اور واقعہ سن لیں جو ہم دو تین ہندوستانی شعراء کو پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب (مرحوم) نے کراچی میں سنایا تھا۔

سال تو مجھے یاد نہیں ممکن ہے عرش ملسیانی کو یاد ہو کیونکہ کراچی کے اس مشاعرے میں وہ بھی شریک تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن غلام محمد مرحوم نے میرے والد محترم، ممتاز حسن احسن (مرحوم) گورنر اسٹیٹ بنک پاکستان، پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی اور اس خاکسار کو چائے پر مدعو کیا۔ والد محترم کو اگلی صبح ہی پہلی فلائٹ سے دہلی واپس آنا تھا۔ اس لیے وہ اس چائے میں شریک نہ ہو سکے ہم چاروں یار شریک ہوئے۔ غلام محمد اللہ انھیں جنت نصیب کرے۔ بہت متواضع، خلیق اور خوش اخلاق انسان تھے۔ سخن فہم تھے۔ اردو اور فارسی کے ہزاروں معیاری اشعار انھیں یاد تھے۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کی مدت میں غلام محمد صاحب نے ہم تین یا چار شاعروں سے کلام سنانے کی کوئی درخواست یا فرمائش نہیں کی۔ وہ ان اوچھے جذباتوں میں نہیں تھے جو مہمان کے سامنے چائے کی ایک پیالی رکھنے سے قبل ہی کہہ اٹھتے ہیں "ہاں صاحب کچھ ارشاد ہو"۔ بات چیت میں حسرت موہانی مرحوم اور ان کی شاعری کا ذکر چل نکلا۔ ہری چند اختر اور عرش ملسیانی نے حسرت موہانی کی درویشی کے کئی قصے سنائے۔ غلام محمد مرحوم کہنے لگے اُن کا ایک عجیب و غریب قصہ میں آپ حضرات کو سناتا ہوں۔ اور وہ قصہ یہ ہے:

"ایک بار میں ہندوستان گیا تو جواہر لال نہرو کے ساتھ دورانِ گفتگو میں حسرت موہانی کا ذکر آگیا۔ اس زمانے میں حسرت موہانی سردار پٹیل سے خفا تھے اور سردار پٹیل حسرت موہانی سے خفا تھے۔ بات چیت کی ابتدا شاید اسی بات سے ہوئی ہوگی۔ حسرت کا ذکر آتے ہی جواہر لال نہرو نے مجھ سے کہا غلام محمد! تم دنیا کے مانے ہوئے ماہر مالیات ہو۔ ہمارے سامنے ایک مالیاتی مسئلہ

---

[1] یہ ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ سنا ہے پالٹکس میں وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بدزبانی پہ اتر آتے تھے۔ اور اکثر اپنے سیاسی مخالفوں کی تواضع وہ گالیوں سے کرتے تھے۔

آگیا ہے۔ اس کا کوئی حل نکالو۔ ہم لوگ تو بہت پریشان ہو گئے ہیں۔"

میں نے عالمِ حیرت میں پوچھا ایسا کون سا مسئلہ ہے جو تمھاری حکومت سے حل نہیں ہو رہا ہے اچھا بتاؤ دیکھتے ہیں۔

جواہر لال نہرو کہنے لگے کہ گزشتہ ماہ پارلیمنٹ کے سکریٹری میرے سامنے یہ مسئلہ لائے کہ مولانا حسرت موہانی نے کئی برس سے اپنا وہ روزانہ بھتہ وصول نہیں کیا جو ہر ممبر پارلیمنٹ کا حق ہے۔ یہ روپیہ بڑھتے بڑھتے پندرہ بیس ہزار روپے تک پہنچ گیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مولانا کہتے ہیں مجھے اس روپے کی ضرورت نہیں اور خزانے والے یہ روپیہ اس بنا پر واپس لینے سے انکار کرتے ہیں کہ یہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کا بھتہ ہے۔ یہ بھتہ انھیں دے کے رسید ہمیں بھجوائی جائے۔ اب روپیہ درمیان میں لٹکا ہوا ہے سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا کیا جائے۔

غلام محمد کہتے ہیں کہ جواہر لال نہرو کی بات سن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور میں سوچ میں بھی پڑ گیا کہ آخر اس مسئلے کا حل کیسے ڈھونڈا جائے۔ چنانچہ میں نے جواہر لال سے کہا کہ میں کل خود حسرت موہانی سے مل کے انھیں مشورہ دوں گا کہ وہ یہ روپیہ قبول کر لیں۔ غلام محمد صاحب بتاتے ہیں کہ میں دوسرے دن خود اس درویش کے آستانے پر پہنچا۔ کافی دیر ان کے ساتھ رہا۔ انھیں یہی مشورہ دیتا رہا کہ آپ یہ روپیہ لے لیں اور جس ادارے کو چاہیں خیرات میں دے دیں لیکن حسرت کا ایک ہی جواب تھا۔ میں اس بکھیڑے میں نہیں پڑ سکتا۔ تم ہی یہ روپیہ جس ادارے کو چاہو دے دو یا جواہر لال نہرو سے کہہ دو، خود کسی ادارے کو دے دیں۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حسرت صاحب کے نام کا روپیہ پاکستان کا گورنر جنرل یا ہندوستان کا وزیر اعظم خود وصول کر کے کسی ادارے کو دے دیتا۔ حسرت صاحب نے اس روپے کو آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی معلوم نہیں انجام کار اس روپے کا کیا ہوا۔"

یہ واقعات تو قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں اس بات چیت کو اس تعلقِ خاطر کے ذکر پر ختم کر دوں جو میرے والد محترم کے دل میں حسرت موہانی کے لیے تھا۔ پہلے یہ واقعہ سن لیجیے جس کی طرف میں نے سر سلطان احمد کے ڈنر کے تعلق سے اشارہ کیا تھا۔ ڈنر سے ایک دن قبل جو مشاعرہ ہوا اور جس کی صدارت اگر میں غلطی نہیں کرتا تو مذکورہ ادب پرور شخصیت غلام محمد ہی نے کی جو اس وقت حکومتِ ہند کے فائنس ممبر تھے۔ اس میں والد نے اپنی وہ غزل پڑھی جو ان کے مجموعۂ غزلیات "شعلۂ نوا" میں ان اشعار سے شروع ہو رہی ہے۔

تقدیر اگر ہے ناموافق — موہوم ہے جذبِ عشقِ صادق

ہو جاتے ہیں دورِ عاشقی میں ۔۔۔۔ حالات تمام ناموافق

اس غزل میں والد نے حسرت کا پورے کا پورا یہ شعر

محروم نہیں تو اور کیا ہے ۔۔۔۔ اس دشمنِ عاشقاں کا عاشق

ان اشعار کے ساتھ اپنی غزل میں شامل کر لیا۔

حسرت نے کہا ہے خوب یہ شعر ۔۔۔۔ بالکل لائے حال کے مطابق

مقطع یہ رہے میری غزل کا ۔۔۔۔ دیں دادِ سخن سخن کے شائق

محروم نہیں تو اور کیا ہے

اس دشمنِ عاشقاں کا عاشق

حسرت صاحب چونکہ خود مشاعرے میں موجود تھے اس لیے اس مقطعے پر جو دراصل حسرت ہی کا ایک شعر ہے بے اندازہ داد ملی اور مذکورہ آخری تین اشعار بار بار پڑھوائے گئے۔

حسرت صاحب جنگ آزادی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے کئی بار جیل گئے۔ ان کی ان قربانیوں کے متعلق والد محترم نے دو بار خامہ فرسائی کی۔ ایک بار رباعیات کی صورت میں اور یہ رباعیات " حسرت موہانی اور قیدِ فرنگ " کے عنوان سے " رباعیاتِ محروم " شامل ہیں اور دوسری بار ایک نظم کی صورت میں جو " بنام حسرت " عنوان سے " کاروانِ وطن " میں شامل ہے۔ میں مذکورہ رباعیات اور نظم پر یہ مقالہ ختم کر رہا ہوں۔ سماعت فرمائیے۔

حسرت موہانی اور قیدِ فرنگ

اے زندہ شہید ! حسرت موہانی ۔۔۔۔ سرکار نے کر دیا تجھے زندانی

لیکن اہلِ وطن کی نظروں میں تو ۔۔۔۔ محبوب ہے مثلِ یوسفِ کنعانی

(۲)

کتنی تری طبع نکتہ رس رنگیں ہے ۔۔۔۔ رنگینیِ طبع سے نفس رنگیں ہے

بلبل تو ہے وہ گلشنِ معنی کا ۔۔۔۔ نغموں سے تیرے ترا قفس رنگیں ہے

(۳)

حاصل ذوقِ ثبات کا ہو جانا ۔۔۔۔ کلفت میں حسرت آشنا ہو جانا

ہے طبعِ شگفتہ کا نرالا اعجاز ۔۔۔۔ زنداں میں ترا غزل سرا ہو جانا

(۴)

پھر قیدِ فرنگ کا زمانہ آیا ۔۔۔ آزاد کی راہ میں قید خانہ آیا
زنداں میں سنی جو بیڑیوں کی جھنکار ۔۔۔ لب پر ترے عشق کا ترانہ آیا

(۵)

کب نغمۂ دل نواز زنداں میں رہا ۔۔۔ یا نالۂ جانگداز زنداں میں رہا
چرچا اس بات کا رہے گا برسوں ۔۔۔ حسرت سا سخن طراز زنداں میں رہا

بنامِ حسرت

اے عاشقِ آزادی، اے حسرتِ موہانی ۔۔۔ اے پیکرِ بربادی ناکام تن آسانی
اعزاز ترا ثابت زنداں کے کہن سے ہے ۔۔۔ تو آج ہے بھارت میں رشکِ مہِ کنعانی
جاں بازِ وطن تجھ سا پیدا نہ ہوا ہوگا ۔۔۔ جرأت پہ تری قرباں خود جذبۂ قربانی
یہ لعل، یہ رنگینی، اور اس پہ یہ سنگینی ۔۔۔ دل توڑ دیا تو نے اے ذوقِ ستم رانی
تاثیر دکھائے گی بے سود نہ جائے گی ۔۔۔ یہ تیری دلافگاری یہ تیری تن افشانی
جو بزم کی زینت تھے جو رزم کی شوکت تھے ۔۔۔ بہتر تو نہ تھے اُن سے جو آج ہیں زندانی

اے اہلِ وطن سننا دل اور جگر تھامے
اٹھتا ہے وہ زنداں سے پھر شورِ غزل خوانی

پریم ناتھ در

پریم ناتھ در کی موت ایک بہت اچھے ادیب، بہت اچھے افسانہ نگار اور بہت اچھے دوست کی موت ہے۔ میرے اور پریم ناتھ در کے باہمی مراسم کی عمر خاصی طویل ہے اور اسی اعتبار سے ان کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد میں اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس کر رہا ہوں۔

پریم ناتھ در کی شخصیت ہر اعتبار سے دل کشی سے لبریز تھی۔ ان کی بات چیت، لب و لہجہ، ملنا جلنا، رکھ رکھاؤ یہ سب ہم لوگوں کے لیے ہمیشہ باعثِ رشک رہا۔ دفتری مصروفیات کے باوجود اپنے فن کے ساتھ ان کی لگن میں بھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آئے تو دہلی میں سب سے پہلے جو ادبی بزم جمی وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جو ان دنوں دلی کالج میں پڑھاتے تھے، پریم ناتھ در کے گہرے دوست تھے۔ پریم ناتھ در نے ان کے ساتھ مل کے حلقۂ اربابِ ذوق کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک طرح سے لاہور ہی کے حلقۂ اربابِ ذوق کا تسلسل تھا، ذہنی اور جذباتی اعتبار سے، اور پریم ناتھ در کی کوششوں سے ہر ہفتے حلقۂ اربابِ ذوق کی محفل باقاعدگی سے دلی کالج میں منعقد ہوتی تھی۔ پریم ناتھ در ہمیشہ باقاعدگی سے ہم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کے دعوت نامے بھیجتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس میں پریم ناتھ در اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے علاوہ ساحر لدھیانوی، امرکاش پنڈت، مہدی عباس حسینی، شمیم کرہانی، غلام احمد فرقت، ریوتی سرن شرما، عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ ایسے فن کار باقاعدگی

سے شریک ہوتے تھے۔ آج یہ محفلیں منعقد کرنے والا خود ایک یا دبن گیا ہے اور اس وقت کسی
پرانے شاعر کا یہ مصرع بے اختیار مجھے یاد آرہا ہے ؎

تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

(ریڈیو کشمیر سری نگر کے شکریے کے ساتھ)

رشید احمد صدیقی

ایک اظہارِ عقیدت

جو صدیقی صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ریڈیو سری نگر سے نشر ہوا۔

رشید احمد صدیقی کے انتقال کی خبر سے میرے دل و دماغ پر جو گزری اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ مولانا عبدالماجد دریابادی کو رو رہے تھے کہ رشید صاحب بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

رشید احمد صدیقی کے ساتھ میرے مراسم کی ابتدا ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور عجیب بات یہ ہے کہ ہماری پہلی ملاقات ریل کے ایک سفر میں ہوئی۔ پٹنے میں اردو کانفرنس تھی۔ اس کے ساتھ مشاعرہ بھی تھا۔ رشید صاحب کو اس کانفرنس کی صدارت کرنا تھی اور مجھے کانفرنس کے علاوہ مشاعرے میں بھی شریک ہونا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں جس ڈبے میں سفر کر رہا تھا دہلی سے، رشید صاحب علی گڑھ سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے۔ میں ان کی تصویر کہیں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی تصویر کھنچوانے سے ہمیشہ نفور رہے۔ انھیں میں نے پہچان لیا۔ آداب عرض کیا۔ اپنا تعارف کرایا اور کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ بعد میں جب میں نے یہ واقعہ اپنے دوست ڈاکٹر مختارالدین احمد سے بیان کیا تو انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ خوش نصیب ہیں ورنہ رشید صاحب نہایت کم گو انسان ہیں اور بہت کم بات کرتے ہیں بالخصوص کسی سے جب پہلی بار ملاقات ہو۔

اس بات چیت میں پنجاب کی شاعری اور پنجاب کے ادب کا ذکر آیا۔ رشید صاحب نے

حفیظ جالندھری کی شاعری کا ذکر نہایت تعریفی انداز میں کیا۔ میں نے کہا رشید صاحب آپ کی زبانی حفیظ صاحب کی تعریف سن کے مجھے حیرت سی ہو رہی ہے اور خوشی بھی۔ خوشی اس لیے کہ حفیظ میرے پسندیدہ شاعروں میں ہے اور حیرت اس لیے کہ حفیظ کے متعلق ہندوستان بھر میں ایک سناٹا ہے اور بالخصوص علی گڑھ میں تو آج حفیظ کو بہت اچھا تو کیا اوسط درجے کا شاعر بھی نہیں سمجھا جاتا۔

رشید صاحب۔ "لیکن ایک زمانہ تھا جب حفیظ علی گڑھ کے محبوب شاعر تھے۔"

میں :- "اس بات پر تو میں بھی حیران ہوں کہ وہ زمانہ اب کہاں چلا گیا۔ حفیظ صرف علی گڑھ ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے محبوب شاعر تھے۔ اس لیے جب آپ نے حفیظ کی شاعری کا ذکر اس قدر تعریفی الفاظ میں کیا ہے تو میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

رشید صاحب : "ادب میں اقدار بدلتی رہتی ہیں اور کسی شاعر کی مقبولیت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہ سکتی۔"

میں : "آپ نے صحیح فرمایا ہے لیکن حفیظ کی شاعری کو تو لوگوں نے بہت جلد فراموش کر دیا ہے۔ اقدار اس قدر جلد کہاں بدلتی ہیں ممکن ہے اس کا سبب ترقی پسند تحریک کا روز افزوں عروج ہو۔ جب سے سردار جعفری نے کچھ اس طرح کی بات کی ہے کہ جب جمہوری نغمے کا وقت تھا تو وہ شاہنامہ اسلام لکھتے رہے۔ جب تحریک آزادی کی لہر اونچی اٹھی تو آزادی کے گیت گانے کے بجائے برطانیہ کے جنگی مقاصد کے نقیب ہو گئے، اور جب عوامی جدوجہد کا زمانہ آیا تو پاکستان کی رجعت پرستی کے سرکاری ترجمان بن گئے، تو ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے حفیظ کی شاعری کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔"

رشید صاحب : "ہو سکتا ہے لیکن کسی شاعر کی زندگی میں اس طرح کے دور عارضی دور ہوتے ہیں۔ حفیظ کی شاعری کو نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں۔"

میں : "رشید صاحب، دہلی میں والد محترم اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے علاوہ میں نے کسی کو حفیظ صاحب کی شاعری کا مداح نہیں پایا۔ حیرت کا مقام ہے۔"

اتنے میں ریل کسی اسٹیشن پر رکی اور یہ بات چیت ختم ہو گئی۔ رشید صاحب نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ میں نے بل ادا کرنا چاہا تو رشید صاحب نے مجھے یہ کہہ کے روک دیا کہ بل میں ادا کروں گا۔ میں سینئر ہوں آپ جونیئر ہیں۔ میں نے تعمیل ارشاد تو کر دی لیکن یہ سینئر جونیئر والی بات

میری سمجھ میں نہ آئی۔ چنانچہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ صدیقی صاحب یہ تو خیر ایک حقیقت ہے کہ آپ سینئر بلکہ سینئر سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور آپ کے سامنے میں جونیئر ہی نہیں بلکہ جونیئر سے بھی کہیں کم ہوں۔ لیکن یہاں یہ اصطلاح میں سمجھا نہیں ہوں۔ اس پر رشید صاحب ہنستے ہوئے بولے یہ علی گڑھ کی اصطلاحیں ہیں اور بالعموم سفر ہی میں کام آتی ہیں۔ سینئر اور جونیئر کے فرائض الگ الگ ہیں۔ مثلاً اب چائے آئی ہے۔ اس کا بل میں ادا کروں گا۔ کیونکہ میں سینئر ہوں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ جونیئر مزے میں بیٹھ کے سفر کرتا رہے گا۔ سینئر کا بستر جونیئر ہی کو باندھنا ہوتا ہے اور جہاں قلی نہ ملے وہاں اسے یہ بستر اٹھا کے اسٹیشن سے باہر لے جانا پڑتا ہے۔ اب اس وقت دیکھیے۔ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہوں۔ اب جب ٹکٹ چیکر آئے گا تو اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا آپ کو کرنا ہوگا۔ ممکن ہے گتھم گتھا ہونے کی نوبت آجائے۔ اس کے لیے تیار رہیے۔ یہ سن کے مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور سامنے کی برتھ پر جو صاحب بیٹھے تھے وہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

اس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ پٹنے میں ہمارا قیام بھی ایک ہی ہوٹل میں تھا۔ یہ دو ایک دن کی رفاقت میرے لیے متاعِ گراں بہا تھی اور جس رشید احمد صدیقی کو پہلے کتابوں میں دیکھا تھا اس کی شخصیت کی ایک بھرپور جھلک اب دیکھنے کو ملی۔

ابھی میں نے شروع ہی میں عرض کیا ہے کہ نام و نمود اور کسی قسم کی خواہش و شہرت سے انھیں ازلی اور ابدی نفرت رہی۔ اسی سے متعلق ایک چھوٹی سی بات اور سن لیجیے۔ ابھی حال ہی میں مالک رام صاحب نے "تحریر" کا رشید احمد صدیقی نمبر نکالا ہے۔ جب یہ نمبر تکمیل کے مرحلوں میں تھا تو مالک رام صاحب نے ہم لوگوں کو خاص ہدایت دے رکھی تھی اور بالخصوص اپنے علی گڑھ کے دوستوں کو کہ رشید صاحب کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے۔ ورنہ وہ اس کی اشاعت رکوا دیں گے۔ آخر جب یہ نمبر چھپ گیا اور اس کی ایک کاپی رشید صاحب کے پاس بھیجی گئی تو انھیں اس خاص نمبر کے چھپنے پر بڑی حیرت ہوئی اور مالک رام کو انھوں نے ایک خط میں لکھا کہ ع "مجھ سے اتنی جو ارادت ہے تو کس بات سے ہے"

پٹنے کی ملاقات کے بعد رشید صاحب سے علی گڑھ میں چند ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک ملاقات سرور صاحب کی معیت میں ہوئی اور ایک مختار الدین احمد کے ساتھ جو ملاقات مختار الدین آرزو کی معیت میں ہوئی اس میں موضوع گفتگو بڑی حد تک اقبال کی شاعری رہی۔ رومی کی مثنوی پر بھی بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا بطور شاعر کے اقبال

رومی سے بڑے ہیں۔ کہنے لگے جو صلابت رومی کے اشعار میں ہے، اقبال کے اشعار میں نہیں ہے۔ اس کے بعد مثالیں دے دے کے اس نکتے پر روشنی ڈالتے رہے۔

اس ملاقات کے بعد ہم دونوں باہر آئے تو ڈاکٹر مختارالدین احمد نے پھر اپنا وہی فقرہ دہرایا کہ آپ اس معاملے میں خوش نصیب واقع ہوئے ہیں۔ رشید صاحب اتنا وقت کم ہی کسی کو دیتے ہیں اور اس طرح کم ہی کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔

رشید صاحب کے ساتھ میری خط و کتابت بھی رہی۔ زیادہ نہیں کم۔ اس ضمن میں اپنے آپ کو میں بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اس خط و کتابت میں دو مواقع ایسے بھی پیدا ہوئے جبکہ رشید صاحب نے خط لکھنے میں پہل کی۔ ابھی ایک دو برس کی بات ہے میرا ایک مقالہ ایک جریدے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا "کلامِ اقبال میں عورت کا مقام" یہ مقالہ انھوں نے پڑھا تو مجھے اس کے متعلق ایک طویل خط لکھا۔ مقالے کی انھوں نے جی کھول کے تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ کو یہاں لفظ مقام نہیں لکھنا چاہیے اسے بدل کے "درجہ" کر دیں یا "مرتبہ" چنانچہ میں نے اس لفظ کو بدل دیا۔ اس ضمن میں دوسرا خط میری ایک نظم کے متعلق ہے۔ یہ بہت پہلے ملا تھا۔ نظم تھی "ماتمِ نہرو" اس میں انھوں نے نظم پڑھ کے یہ مشورہ دیا تھا کہ اس نظم کے فلاں دو بندوں کو ملا کے ایک کر دیں یعنی چھ مصرعے نکال دیں۔ نظم کا تاثر بڑھ جائے گا۔

رشید صاحب کے خطوط اور رشید صاحب سے ملاقاتیں میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ اُن کے ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو جانے پر اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس سے بہت صدمہ ہوا ہے تو یہ ایک چھوٹی بات ہوگی۔ رشید صاحب ایک بڑے نثر نگار، بڑے نقاد، بلند پایہ معلم اور بڑے انسان تھے۔ ان کے چلے جانے سے اردو ادب اور ہندوستان بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی دنیائے ادب میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے اور اس مختصر سی بات چیت کے خاتمے پر مجھے علامہ صاحب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

باکمال انساں کا مر جانا ہے نقصانِ خدا
کچھ خدا کا بھی تو مرگِ ناگہاں کھویا گیا

محروم ـــــ میرے والد

مسلسل پینتیس[۳۵] برس تک سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت کرنے کے بعد والدِ محترم جب کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئے تو انھوں نے اپنے عرصۂ ملازمت کا جائزہ ان اشعار میں لیا۔

سی و پنج سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد ـــ سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم
شرفم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی ـــ بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

یہ ہیں ایک شاعر کی مسلسل پینتیس برس کی ملازمت کے تاثرات

پینتیس برس ـــــ زندگی کا ایک حصہ ـــــ بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم اور اس کے باوجود مسلسل تخلیقِ فن کا سلسلہ جو آخری دن تک جاری رہا۔ پینتیس برس کی اس مسلسل گھٹن کا اندازہ ان تنقیدی یا تعریفی مقالات سے نہیں ہو سکتا جو مختلف رسائل اور کتابوں میں والد اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ والد کی زندگی کے وہ گوشے جوان کے تخلص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں اور اس قطعے میں خوابیدہ ہیں ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔ میں اس مقالے میں بعض ایسے ہی گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد سے جب میں نے ذکر کیا کہ طفیل صاحب[۱] کا خط آیا ہے اور انھوں نے مجھ سے آپ کے

---

[۱] یہ مقالہ اپنی ابتدائی صورت میں جناب محمد طفیل مدیر "نقوش" لاہور کی فرمائش پر "نقوش" کے شخصیات نمبر کے لیے لکھا گیا تھا۔ والدِ محترم اس وقت حیات تھے۔ بعد میں ان کے انتقال کے بعد اس میں اضافے کر کے اسے موجودہ صورت دی گئی۔

بارے میں مقالہ لکھنے کے لیے کہا ہے۔ کچھ مشورہ دیجیے کیا لکھوں تو کہنے لگے کہ میری زندگی میں ایسے واقعات پیدا ہی نہیں ہوئے جنھیں رسالے کے لیے لکھا جائے اور جو واقعات ہیں وہ مل کر ہمارے سماج کی کوئی تصویر پیش نہیں کرتے۔ پنجاب کی تلخیوں اور تعصبات کا زمانہ اسے دہرانا کوئی مستحسن بات نہیں۔ میانوالی اور راولپنڈی کے واقعات تو تمھیں یاد ہی ہوں گے۔ اگر مفتی احمد سعید اور بیرسٹر محمد جان میری امداد نہ کرتے تو متعصب لوگ میری زندگی ہی دشوار بنا دیتے۔ اب بھی انھوں نے کچھ کم پریشان نہیں کیا۔ اس سے پہلے بھی جب تم بہت چھوٹے تھے مجھے مخالفوں نے مسلسل کئی برس تک پریشان کیا۔ یہ باتیں لکھنے کی تھوڑا ہی ہیں۔

انھوں نے مقالہ نہ لکھنے کی جو وجہ بیان کی وہی میرے لیے یہ چند سطور لکھنے کی وجہِ جواز بن گئی۔ پریشان کرنے والے لوگوں یعنی بعض مسلمانوں نے بر بنائے تعصب مخالفت کی اور امداد کس نے کی؟ مسلمانوں ہی نے۔ اب ایک غیر مسلم شاعر کی زندگی کا یہ گوشہ پڑھنے والوں کے سامنے کیوں نہ آئے۔ اس سے بڑی وجہ ایک شاعر کی داستانِ حیات لکھنے کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر جتنی قدر دانی ہوئی وہ کن لوگوں نے کی۔ کیا ان میں سے بیشتر مسلمان نہیں تھے تو گویا یہ تو تاریخِ ادب کا ایک ایسا باب ہے جو آج سے بہت پہلے معرضِ تحریر میں آجانا چاہیئے تھا۔

(۲)

یکم جولائی ۱۸۸۷ء والد کا سنِ پیدائش ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے میانوالی کے ضلع میں گاجراں والا کا نام کا ایک گاؤں ان کی جنم بھومی ہے۔ یہ گاؤں اسی زمانے میں دریا برد ہو گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی تھوڑی بہت کاشت کاری اور معمولی دکانداری کو چھوڑ کر عیسیٰ خیل آگیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ والد کی عمر اس وقت یہی پانچ سات برس کی تھی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "میرا بچپن دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ موسم گرما میں عموماً سارا سارا دن اس دریا میں نہانے اور تیرنے میں گزر جاتا تھا۔ ساون بھادوں کی برسات میں جب سارا گاؤں زیرِ آب ہو جاتا تو تمام مکان (کچے کوٹھے اور چھپر) گر جاتے تھے۔ اہلِ دہ کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا لیکن چونکہ سب اس کے عادی ہو چکے تھے کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لیتے تھے۔ ہم بچوں کے لیے تو پانی کا اس طرح موجیں مارتے ہوئے گھروں کے اندر آجانا باعثِ تفریح بن جاتا تھا۔ گرے ہوئے ملبے سے کواڑوں کے تختے لے کر ان کی کشتیاں بنا لینا اور انھیں اِدھر اُدھر کھینچتے رہنا ان ایام میں ہمارا بہترین

مشغلہ ہوتا تھا۔ اب جو غالب کا شعر پڑھتا ہوں تو وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط ان کی گفتار اور اشعار میں آخر تک موجود رہا اور انھوں نے متعدد نظموں میں اپنے ان دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔

بھولا نہیں عالم تری امواجِ رواں کا
وہ ماضیٔ رقصاں مری عمرِ گزراں کا
تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا
افسوس کہاں میں ہوں یہ قصہ ہے کہاں کا
گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا
طفلی بھی جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا

تقدیسِ وطن سے مجھے انکار نہیں ہے
گو پاک نہیں اس سے سروکار نہیں ہے
کیا کیجیے وہ آر نہیں پار نہیں ہے
آسودہ کسی طور دلِ زار نہیں ہے
وہ ہمہمہ وہ جوش و خروش اس میں کہاں ہے
افسردہ سی بے جان سی اک لہر رواں ہے

گو جور و جفا کی تجھے عادت بھی رہی ہے
فطرت تری کچھ مائلِ وحشت بھی رہی ہے
مضمر ترے طوفان میں آفت بھی رہی ہے
ساتھ اس کے نمایاں یہ حقیقت بھی رہی ہے
دیہات اجاڑے تو بسائے بھی ہیں تو نے
نقشے جو بگاڑے تو بنائے بھی ہیں تو نے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ
آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہِ حسنِ خداداد جو قریہ
ہر قید تکلف سے تھا آزاد جو قریہ
بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون تو ہوگا وہی ہو گرچہ زمیں اور

ان کی باقاعدہ تعلیم کوئی چھ سات برس کی عمر میں شروع ہوئی جس کے لیے ورنیکلر فائنل مڈل اسکول عیسیٰ خیل میں داخلہ ہوا۔ پرائمری سے ہائی اسکول تک ہر جماعت میں اول رہے پانچویں اور آٹھویں جماعت کے امتحانوں میں سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی اسکول نہ تھا۔ اس لیے مزید تعلیم کے لیے ساٹھ ستر میل دور بنوں جا کر وکٹوریہ ڈائمنڈ

جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۰۷ء میں میٹریکولیشن کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحان بعد کو ملازمت کے دوران میں پاس کیے۔

میٹریکولیشن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں آئے۔ رستے میں پہلی بار ملکہ نورجہاں کا مقبرہ دیکھا۔ ان کی مشہور نظم "نورجہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس کے بارے میں انھوں نے ایک بار مجھے بتایا کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف بیلیں چڑھی ہوئی ہیں اور ویرانی کا وہ عالم نہیں۔ لیکن اس زمانے میں جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا ہے اس مقبرے کی کیفیت واقعی یہی تھی کہ:

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپّر اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور رہے یوں گورِ غریبانہ کسی کی
آباد رہے محفلِ جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہ فقیر طبع انسان تھے۔ ہر آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے تھے اور کہیں کوئی سادھو سنیاسی مل جاتا تو اس کے ساتھ ہو لیتے تھے اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے تھے۔ چھوٹے دادا کو اردو، فارسی سے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ اوائل عمر میں انھوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن یہ شوق جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہو گیا اس کی یادگار ایک سال کی بچی رہ گئی ــــ وِدّیا۔ میری بہن جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے مسرت چھین لی۔

سال بھر بعد دوسری شادی ہوئی۔ یہ میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں دو برس بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر سے بعد کے واقعات میری یادوں کے دھندلکے میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ ہی کا نہیں بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں پہلوؤں کی حامل ہوں گی۔

(۳)

اپنے بچپن کا زمانہ میری نظر کے سامنے ہے۔ عیسیٰ خیل میں ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ والد، والدہ، وِدّیا اور میں ــ ہم چار افراد اس میں رہتے ہیں۔ سردیوں کے دن ہیں۔ والد مکان

کی چھت پر دھوپ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے سامنے ہے۔ گنگنا رہے ہیں۔ والدہ مجھے اور ودیا کو اوپر بھیجتی ہیں کہ جا کر کہو بازار سے ترکاری لے آئیں ہم دونوں اوپر جاتے ہیں۔ دو ایک بار انھیں پکارتے ہیں۔ لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم اس خوف سے کہ کہیں جھڑک ہی نہ دیں۔ فوراً واپس آ جاتے ہیں۔ اخبار یا کتاب کی جانب ان کی محویت کا ہمیشہ یہی عالم رہا۔ وہ محوِ مطالعہ ہوں تو انھیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے دو چار بار پکارنا بے سود ثابت ہوتا تھا۔ ان کی محویت سے قطع نظر ان کا خوف اس تصویر کا ایک اور پہلو تھا جو ایک زمانے تک قائم رہا اور جس کے بچے کھچے نقوش آخر تک باقی رہے۔

میرے اور ودیا کے دل میں ایک مدت تک والد کی محبت کے مقابلے میں شاید ان کا خوف زیادہ غالب رہا۔ یہ ان کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اس خوف کا مفہوم ممکن ہے نئی نسل کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ کیونکہ "بزرگ خاندان" کا تصور نئے دور میں قریب قریب روبہ زوال ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ اندازِ مزاج شفقتِ پدری کے راستے میں حائل رہی بلکہ جہاں تک میرا اور ودیا کا تعلق ہے ہمیں اس شفقت کا حصہ وافر ملا ہے۔ ہاں میری چھوٹی بہنیں ساوتری اور کرشنا اس محبت سے پوری طرح شاد کام نہیں ہو سکیں۔ کیونکہ انھوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب ودیا کی خودکشی کے باعث والد کا دل بجھ چکا تھا۔ ودیا نے جو بائیس برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی، سسرال میں ایک جھگڑے کی بنا پر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا دی تھی۔ اس کے بعد آخر تک والد کے چہرے پر میں نے وہ مسرت نہیں دیکھی جو اس حادثے سے قبل نظر آیا کرتی تھی۔ والد کی زندگی کا یہ حادثہ کئی انداز سے شعر میں ڈھل کر آیا۔ لیکن انھوں نے اپنے اس ذاتی غم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا اس لیے یہ اشعار مدت تک کہیں منظرِ عام پر نہیں آ سکے۔

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا | افسوس اسی شمشان میں کھائیں گے بیس گے
تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر | ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

بجھ نہیں سکتی جو دل میں آگ ہے بھڑکی ہوئی | عالمِ فانی میں اب راحت کہاں میرے لیے
سچ تو یہ ہے تیرے جل مرنے سے اے لختِ جگر | ہو گئے دوزخ زمین و آسماں میرے لیے

پہلے ہی عزا خانہ تھی وہ میری نظر میں
افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا
اے لختِ جگر! آہ کہ جس مرنے سے تیرے
میرے لیے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

تاب اک لو کے کی لا سکتی نہیں جانِ بشر
ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے انساں بے قرار
ہائے کن مجبوریوں میں تو نے اے لختِ جگر
کر لیا ملبوسِ تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دلِ بے تاب جلتا ہی رہے گا اس کی حدت سے
زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی وِدّیا
جگر بھنتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں
تصور میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی وِدّیا

کین غلک اے وائے کہ داغِ جگرم داد
فریاد بر آورد م و داغِ دگرم داد
ایں داغِ جگر پارۂ خونِ جگرم سوخت
ویں داغ دگر آہ کہ سرتا بسرم سوخت

"آں داغِ جگر" اشارہ ہے میری چھوٹی بہن کی موت کی جانب۔ یہ بچی دو برس کی عمر میں دس بارہ دن بیمار رہ کر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تھی۔ اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنایا گیا تھا۔ والد اور امی مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر والد ہر روز ایک نظم کہتے تھے۔ تین دن کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ یہ نظمیں بھی ایک مدت تک کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ بعد میں یہ میں نے والد کے مجموعۂ کلام "نیرنگِ معانی" میں شامل کیں۔

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں
اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا
وحشت فضا مقام ہے جنگل ہے ہولناک
یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا
خوابِ گراں میں تو ہے ابھی زیرِ خاکِ سرد
بیدار کائنات ہے ساری شکنتلا
خوش ہو کے پھر اچھل کہ جگن میرے ساتھ ہے
آنکھوں سے اس کی اشک ہیں جاری شکنتلا
آنکھوں میں آ گیا دلِ صد چاک کا لہو
پتھر پہ تجھ کو دیکھ کے بھاری شکنتلا

ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر
کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آگئے
اے کاش زیرِ خاک سے ہو آشکار تو

ہم دودھ لے کے آئے تھے گھر سے ترے لیے
دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیر خوار تو

گھر میں تو رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ
آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تو

افسوس عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات
جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بے قرار تو

روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج
وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو

بھولا غمِ جہاں تجھے جب گود میں لیا
آئی تھی بن کے راحتِ جانِ نزار تو

جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب
اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

تیرے لیے دعا ہے دلِ غم نصیب کی
ہو بہرہ یابِ رحمتِ پروردگار تو

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب
کس نے شکنتلا تجھے یوں کر دیا خموش

مطلب یہ تھا کہ تو مرے نالوں سے جاگ اٹھے
فطرت میں ورنہ ہے دلِ درد آشنا خموش

مجھ بدنصیب کے لیے تیری خموشیاں
ایمائے خامشی ہیں تو ہو جاؤں گا خموش

طاری ہے آہ! شہرِ خموشاں پہ کیا سکوت
خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش

سر منزلِ دیارِ عدم ہے یہی مقام
ڈیرے لگے ہوئے ہیں مگر بے صدا خموش

وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اترتے ہیں
سینے میں سانس روک کے جوں نقشِ پا خموش

دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں
پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش

نغمے خوشی کے ہیں نہ کہیں نالہ ہائے غم
یکسر ہیں ساکنانِ دیارِ فنا خموش

صدمہ نہ تاکہ ہو تری معصوم روح کو
ہوتا ہے ساز اب مری فریاد کا خموش

شکنتلا کے ذکر سے پہلے میں ودیا کی خودکشی کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہم راولپنڈی میں تھے جس روز دوپہر کو اس حادثے کی اطلاع تار کے ذریعے سے ملی اسی روز جب صبح کو ـــــ حادثے کی اطلاع سے پانچ سات گھنٹے قبل ـــــ والد بیدار ہوئے تو میں نے انھیں خلافِ معمول بہت افسردہ پایا۔ میں نے ان سے دو ایک بار پوچھا کہ طبیعت تو آپ کی اچھی

ہے؟ رات کو نیند تو ٹھیک سے آئی؟ انھوں نے کہا۔ ہاں بالکل اچھا ہوں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یوں ہی طبیعت پریشان سی ہے۔ حسب معمول سیر کو چلے گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ افسردگی کا عالم بدستور طاری تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسکول یا کنٹونمنٹ بورڈ کا کوئی معاملہ پریشان کر رہا ہوگا۔ دوبارہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کی ہیڈ ماسٹری ان کے لیے دردِ سر تھا۔ میرا گمان یہی رہا کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس دن اسکول جانے تک والد خلافِ معمول خاموش ہی رہے۔ اپنی پریشانی کو چھپانا ان کے بس میں نہ تھا۔ دوپہر کو تار ملا جس میں یہ الفاظ درج تھے VIDYA DIED THIS MORNING وہی صبح کا وقت جب والد افسردہ خاطری کے عالم میں بیدار ہوتے ہیں ودیا اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر رہی تھی۔ مہرِ پدری کو اس حادثے کی اطلاع کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی رہی تھی۔

یہ میری بہنوں کی زندگی اور موت کا ذکر تھا جو بلا ارادہ نوکِ قلم پر آگیا۔ ورنہ میں کہہ تو یہ رہا تھا کہ آج سے چونتیس برس پہلے[1] ہم لوگ کیسے رہتے سہتے تھے۔ عیسیٰ خیل (مغربی پنجاب) میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمارا وطن ہے۔ اس لیے محبوب ہے ورنہ زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں اس شہر میں قطعاً مفقود ہیں۔ زندگی کی اولین ضرورت پانی یہاں کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اب نہ جانے کیا کیفیت ہے۔ میں، اپنے زمانے کی بات بتا رہا ہوں۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا۔ شہر کی عورتیں ہر صبح و شام اپنے سر پر دو گھڑے رکھ کر پانی بھرنے جایا کرتی تھیں اور گھر کی ضروریات کے مطابق دن میں کئی کئی بار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوا باہر کا سارا کام مردوں کے سپرد تھا اور گھر کے اندر کا سارا کام عورتوں کے سپرد۔ یہ پانی اس قابل نہیں ہوتا کہ پیا جائے لیکن سارا شہر یہی پانی پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی عمر میں اس شہر سے نکلے اور بنوں اور لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں چودہ برس گزارنے کے بعد جب دوبارہ عیسیٰ خیل میں آئے تو شہر کے پانی سے بیزار ہو گئے۔ انھیں ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ یہ پانی ہم لوگوں کو بیمار کر دے گا۔ چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں میں پھٹکری کی ڈلی

---

[1] "نقوش" (لاہور) شخصیات نمبر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ مقالے کا یہ حصہ شخصیات نمبر کی اشاعت سے دو ایک ماہ قبل لکھا گیا ہوگا۔

پھیرا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو یہ خاص ہدایت تھی کہ پانی گلاس میں اس طرح سے انڈیلیں کہ تہ کے قریب کے پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ اس تمام احتیاط کے باوجود پانی نے اپنا اثر دکھایا اور والد بیمار پڑ گئے۔ پانی کی مٹی نے جمع ہو ہو کر ان کے گردے میں پتھری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شدت درد کے ناقابلِ بیان عالم میں انھیں چارپائی پر لٹا کر پھر اسی شہر بنوں میں لے جایا گیا جہاں وہ ایک مدت تک زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر پینیل ایک مشہور انگریز ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے آپریشن کر کے پتھری خارج کی، اور والد انتہائی نقاہت کے عالم میں واپس گھر آئے۔ اب ہر لحظہ عیسیٰ خیل کو چھوڑنے کی تجویزیں پیشِ نظر تھیں لیکن اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی احمد سعید میانوالی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ گجرات ان کا وطن تھا نیک خصلت اور تعصب سے بالا انسان تھے۔ ذوقِ سخن رکھتے تھے۔ والد کے مداح تھے اور قدردان۔ ان سے والد نے اپنی مشکل بیان کی کہ اس شہر سے مجھے نکال لیجیے ورنہ پھر بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے ان کا تبادلہ کلور کوٹ کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

(۴)

کلور کوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں کے اردگرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں بکثرت آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ بادل اٹھتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ نعمتِ غیر مترقبہ ——— صاف ستھرا پانی ——— جس کی تلاش میں والد نے اپنا شہر چھوڑا تھا یہاں، بافراط موجود تھا۔ اب والد کو یقین ہو گیا کہ یہاں پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچروں میں شاید دس جماعت سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ ان کی ذہنیت وہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک ٹیچر صاحب نے ایک دن اپنے طلبہ سے کہا کہ کل سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے ایک ایک اکنی لے کر آئیں۔ مجموعی رقم سے کلاس روم کے لیے جھاڑن خریدا جائے گا۔ والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھیں ضابطے اور اخلاق کے پیش نظر یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے اس ٹیچر کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ حرکت تمھارے لیے اور سارے اسکول کے لیے بدنامی کا باعث ہے۔ جب سرکاری طور پر کلاس روم کے ڈسٹر مہیا کیے جاتے ہیں تو خلاف قاعدہ طلبہ سے پیسے جمع کرنے

کے کیا معنی؟ وہ صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن انھوں نے دوسرے ٹیچروں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ کرتا ہے۔ کلور کوٹ میں آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان شہر سے دور مختلف دیہات میں آباد تھے۔ ان میں رئیس اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی تھے۔ خوش حال اور کھاتے پیتے بھی اور ایسے بھی جنھیں مفلس کہا جائے۔ ان دیہات میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے معمولی پرائمری اسکول بھی کوئی نہ تھا۔ انگریزی مڈل کا تو کیا سوال؟ لہٰذا مسلمان طلبہ کے لیے کلور کوٹ میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ جب ہم کلور کوٹ میں آئے تو اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے ان دیہاتی طلبہ کی سہولت کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کر دیا، جس میں بے شمار مسلمان طلبہ دیہات سے آکر داخل ہو گئے اور اسکول میں ان کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اس بات سے دیہات کے تمام مسلمان خواہ وہ لوگ نمبردار تھے یا ذیلدار، معمولی کاشت کار تھے یا دوکاندار بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی لیکن اسکول کے ٹیچروں کی ذہنیت جو تھی وہی رہی۔ ایک ٹیچر نے بورڈنگ ہاؤس سے دو چار پائیاں چرالیں اور جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے والد کو متعصب ہندو کہنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ ٹیچر لوگ ایسے تھے جو کسی طرح معلمی کے مقدس کام کے لیے موزوں نہیں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز دو ایک طلبہ کو اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور وہ طلبہ وہاں دن بھر طرح طرح کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ کام یہ ہوتے تھے۔ گائے بھینس کے لیے کھلی اور چارے کا انتظام، چارپائی وغیرہ کی بنائی، گھر کی صفائی اور بچوں کو ادھر ادھر لیے پھرنا وغیرہم۔ ایک اور صاحب نے طلبہ کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور اپنی اپنی باری کے مطابق ہر طالب علم ان کے لیے گھر سے لسی لایا کرتا تھا۔ ٹیچر صاحب لسی میں مکھن کی موجودگی پر بھی اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک ٹیچر صاحب جیب میں تاش ڈال کر اسکول آیا کرتے تھے اور جب موقع ملتا وہ تین ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ والد ان بدعنوانیوں کو گوارا نہ کر سکے۔ مشورہ، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے سے انھیں روکنا چاہا۔ انھوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مفتی احمد سعید ایک شریف اور غیر متعصب مسلمان تھے۔ ان پر ان شکایات کا مطلقاً کوئی اثر نہ ہوا اور سازشیوں کو ہر بار منہ کی

کھانا پڑی۔ لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مختلف مزاج کے افسر تھے۔ انھوں نے ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے خلاف انکوائری قائم کی گئی۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے والد نے اتنا کچھ کیا اور انکوائری اس الزام کی تحقیق کے لیے ہو رہی تھی کہ یہ متعصب ہیں اور مسلمان طلبہ اور ٹیچروں کو پریشان کرتے ہیں۔

بہ جرمِ عشق توام می کشند و غوغا ئیست

تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ئیست

انھوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط لکھا۔

"فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی"

لیکن وہ اب دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر خود انکوائری کے لیے تشریف لائے، ڈاک بنگلے میں عدالت قائم ہوئی۔ شہر کے ہندوؤں کو تو گواہی کے لیے بلایا نہ گیا تھا۔ دیہات کے مسلمان اور اسکول کے ٹیچر اور طلبہ موجود تھے۔ ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ٹیچروں نے دو چار معصوم طلبہ کو تو ورغلا لیا، لیکن دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور ذمہ دار مسلمان طلبہ نے سازشی ٹیچروں کے خلاف گواہی دی اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو اس بات پر مجبور کیا کہ موجودہ ہیڈ ماسٹر کا کلور کوٹ سے ہرگز تبادلہ نہ کیا جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام شاید جاری نہ رہ سکے۔ والد کے لیے یہ ایک عظیم فتح تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس ماحول سے دل برداشتہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ والد نے قومی اور ملکی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہیں اور یہ تمام نظمیں بغیر نام کے مختلف اخبارات میں چھپیں۔ اگر نام سے چھپتیں تو نوکری محفوظ نہیں تھی۔ وہ نظم کے ساتھ ایک خط ایڈیٹر کو لکھ دیا کرتے تھے کہ یہ نظم بغیر نام کے یا کسی فرضی نام سے چھاپ دی جائے۔ نہ جانے یہ بات کیوں ان کے ذہن میں نہ آئی کہ اخبارات کی ڈاک سنسر بھی ہو سکتی ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ ڈاک ہر روز سنسر ہو رہی تھی۔ والد کے خطوط کی نقل میانوالی کی خفیہ پولیس کو بھیج دی جایا کرتی تھی اور ان کے بارے میں میانوالی پولیس ایک فائل تیار کر رہی تھی۔

لالہ لاجپت رائے کے انتقال پر انھوں نے ایک طویل نظم کہی۔ یہ نظم لاہور کے ایک پبلشر نے کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ والد کا نام اس نظم پر موجود تھا۔ اس نظم نے پولیس کی فائل کو "مکمل" کر دیا اور یہ فائل ایک اور انکوائری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اب کے معاملہ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کا نام رادھا کرشن تھا۔ حکومت کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب بھی انھیں ملا ہوا تھا۔ اس انکوائری میں والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اپنے خطوط کی نقول اور بعض حالات میں اصل خطوط اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں موجود تھیں۔ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی تھی۔ رادھا کرشن ضلع کے دورے پر کلور کوٹ آئے۔ والد کو انھوں نے اسی ڈاک بنگلے میں طلب کیا اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ والد اپنے خلاف اتنا سنگین معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق سے سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جائیے یا تو کانگرس کی تحریک میں شامل ہو جائیے یا سرکاری نوکری میں رہیے۔ وہ تو یہ حکم دے کر چلے گئے۔ والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی۔ لیکن اس سارے واقعے سے انھوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا لیکن انھوں نے اس واقعے کا جب بھی ذکر کیا بڑے افسوس کے ساتھ کہ وہ بھی کیا نیکی جو تعصب کی بنا پر کی جائے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے قدر دانی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تعصب کی بنا پر قدر دانی کی تو کس کام کی۔

عیسیٰ خیل کے مرحوم نواب سیف اللہ خاں کا تذکرہ اس موقعے پر وہ ضرور کرتے تھے۔ سیف اللہ خاں مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تھی تو بغلگیر ہو کر ملتے تھے اور بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خاں سے نواب احمد یار خاں دولتانہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا جہاں محروم صاحب رہتے ہیں؟ انھوں نے والد سے اس واقعے کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ تو ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جائدادوں کے

مالک ہم ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ماسٹر سے زیادہ نہیں لیکن ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ سے مشہور رہے، آپ کی ذات ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔

کلور کوٹ سے آب و دانہ انھیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے ڈی اے وی کالج راولپنڈی میں داخلہ لے لیا تھا۔ والد کلور کوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی، کوشش کر کے انھوں نے تبادلہ راولپنڈی کرا لیا۔ یہاں وہ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدم کا قیام ان دنوں یہیں راولپنڈی میں تھا۔ عطاء اللہ کلیم، عبدالعزیز فطرت، آغا صدیق، حسن ضیا، اظہر امرتسری، حاجی سرحدی، یہ سب حضرات یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم ایک پر تکلف دعوت کی صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آ گئی۔ ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوش گوار بن گئی لیکن اسکول کے حالات یہاں بھی دردِ سر بن گئے۔ کلور کوٹ میں تو ایک افسر تھا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز، یہاں کنٹونمنٹ بورڈ کا ہر ممبر افسر تھا۔ ایک ممبر محمد رفیع کو تو ان سے پہلے دن ہی سے بغضِ للّٰہی پیدا ہو گیا۔ اس نے انھیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ایک اور ممبر محمد جان بیرسٹر ایٹ لا نے جو بعد میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج بنے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ یہاں دو ایک ٹیچر محمد رفیع سے مل گئے جس سے والد کی پریشانیوں میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت صفائی کے لمبے لمبے بیانات لکھنے میں ضائع ہو جاتا تھا۔ چند برس بعد محمد رفیع کا انتقال ہو گیا اور صورت حال سکون پذیر ہو گئی۔

یہاں سے آپ ۱۹۴۳ء میں ریٹائر ہوتے اور آپ نے :

سی و پنج سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد	سحرِ شبابِ خود را ہمہ تیرہ شام کردم
شرمم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی	بہ سگانِ ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

کہہ کر اطمینان کا سانس لیا۔

(۵)

فوراً بعد آپ گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو اور فارسی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ مولانا تاجور مرحوم کو اس تقرر کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تمھارے والد کو جہاں شروع میں

پہنچنا چاہئے تھا وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت قریباً ضائع ہی ہوا ہے۔ انہیں شروع ہی سے کسی جگہ اردو اور فارسی کا لیکچرر مقرر ہونا چاہیئے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون سے بسر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہنگامۂ کشت وخون میں کپتان عبد المجید (اللہ انھیں ہمیشہ ہر جگہ آبرو سے رکھے) نامی ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر وعافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہ ہزار دقت امرتسر اور پھر جالندھر آئے۔ میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ انھوں نے مجھے خط لکھا کہ "جالندھر تک تو آگیا ہوں دہلی تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ ہر طرف ایک افراتفری اور کس مپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا۔" لیکن کون مسلمان اس وقت جالندھر میں اس قابل تھا کہ اُن کی خدمت کر سکتا۔ بڑی مشکلوں سے دہلی پہنچے۔ یہاں لالہ دیش بندھو گپتا آنجہانی نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۵۸ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کی اس سبکدوشی کی یادگار یہ رباعی ہے۔

پیری دیتی ہے سب کو عزلت کا پیام
محروم یہی ہے عمر فانی کا نظام
کالج کو وداع نوجوانوں کو سلام
پیرانِ کہن سال کی محفل میں چلو

آپ کی طبیعت یوں بھی ہنگاموں سے نفور تھی۔ کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد تو آپ نے مکمل طور پر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ صحت اس زمانے میں ان کی اگرچہ بہت اچھی نہیں تھی لیکن خراب بھی نہیں تھی۔ صبح کی سیر اور رات کو کھانے کے بعد چہل قدمی ان کا معمول تھا۔ ہاں نظر کسی حد تک کمزور ہو گئی تھی اس لیے اخبار کا مطالعہ اس کی سرخیوں ہی تک محدود ہو کے رہ گیا تھا۔ اخبار سے ویسے بھی انھیں دلی لگاؤ کبھی نہیں رہا اگرچہ ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر بھی آپ رہ چکے تھے۔

کتابوں کا مطالعہ انھوں نے آخر تک جاری رکھا۔ دیوان بیدل، دیوان ناصر علی اور رباعیات عمر خیام ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں لیکن آخری برسوں میں ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا جب ان کی توجہ تمام کتابوں سے ہٹ کر صرف گیتا پر مبذول ہو گئی تھی اور ہر روز وہ اس کا

مطالعہ بلاناغہ کرتے تھے۔ انھوں نے گیتا کا اردو نظم میں ترجمہ بھی کیا ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے
کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومت ہند نے ادبی خدمات کے سلسلے میں ان کی پنشن مقرر کر دی جو تا دم زیست جاری رہی۔ اسی دوران میں حکومتِ پنجاب نے انھیں گیارہ سو روپے کی تھیلی خلعت اور سپاسنامہ پیش کیا۔ یہ جلسہ مارچ ۱۹۶۲ء میں منعقد ہوا۔ آپ نے اس موقع پر حکومت پنجاب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں پنجاب اور اردو کے صدیوں پرانے رشتے پر روشنی ڈالی اور اس بات پر زور دیا کہ پنجاب میں اردو کو اس کا صحیح مقام ملنا چاہیئے۔

حکومتِ پنجاب کی اس عزت افزائی کے فوراً بعد انھیں مبارکباد دینے کے لیے دہلی میں متعدد جلسے ہوئے۔ اس سلسلے میں ایک جلسہ دہلی یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں آپ نے اظہار تشکر کے طور پر یہ رباعی پڑھی۔

دنیائے کمال فضل بہ دارِ علوم — اقصائے جہاں میں آج جس کی ہے دھوم
خود دادِ سخنوری تجھے دیتا ہے — آداب بجالاؤ ادب سے محروم

انجمن تعمیر اردو نے بھی ایک جلسہ منعقد کیا لیکن آپ علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے۔ انجمن نے اس موقعے پر ایک سپاس نامہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔
گورنمنٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن اور بزم سخن موتی باغ نے ایک مشترکہ جلسے کا انعقاد کیا۔ اس جلسے میں آپ نے جو کلام پڑھا اس میں یہ رباعی آپ کے زندگی بھر کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔

احباب نے یہ جو عزت افزائی کی — تکلیف اٹھا کے جلسہ آرائی کی
میں گوشہ نشیں کہاں کہاں یہ اعزاز — نادم ہوں قسم ہے کنجِ تنہائی کی

(۶)

تقسیم ہند کے بعد دہلی آکر اگرچہ انھیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے ایک ناآسودگی ان کے احساس میں سرایت کر گئی ہے۔ جب تک جوش ملیح آبادی دہلی میں رہے۔ ان کے ساتھ آپ کا باقاعدہ ملنا جلنا رہا۔ جوش صاحب بھی والد سے ملنے ہمارے گھر اکثر آتے تھے والد زیادہ تر جوش صاحب سے ملنے ہلی کیشنز ڈویژن ہی جایا کرتے تھے دونوں کی گفتگو کا موضوع بالعموم فارسی شاعری رہتا تھا۔

جوش صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد ان کا گھر سے نکلنے کا بہانہ بڑی حد تک ختم ہوگیا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ اپنے ماحول میں ایک طرح کی تنہائی سی محسوس کر رہے ہیں۔ تنہائی کا یہ احساس اس وقت اور زیادہ ہوگیا جب ہم لوگ پرانی دہلی سے منتقل ہو کر نئی دہلی میں آگئے موتی باغ بھی ملنے جلنے کے اعتبار سے غنیمت تھا۔ لیکن جہانگیر پوری کی کالونی تو بالکل "کسے را با کسے کارے نہ باشد" کی تصویر تھی۔ اس کالونی پر محیط سناٹے نے فرود الدکی طبیعت پر ناخوش گوار اثر ڈالا ہوگا لیکن جس ناآسودگی کا میں نے ذکر کیا ہے اس کی ابتدا ۱۹۴۸ء ہی سے ہوگئی تھی۔ 'پاکستان کو الوداع'، 'ساکنانِ دیارِ پاکستان'، 'گارڈن کالج راولپنڈی کی یاد'، 'لے جا پیام ایک غریب الدّیار کا'، اور 'دریائے سندھ کی یاد' وغیرہ اسی ناآسودگی ہی کی مختلف جھلکیاں ہیں۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں وہ گارڈن کالج کی گولڈن جوبلی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے راولپنڈی تشریف لے گئے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ اُن کا راولپنڈی کا پہلا اور آخری سفر تھا۔ اس سفر کی یادگار یہ رباعیاں ہیں جن سے اس تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں راولپنڈی کی سرزمین سے تھا۔

پھر اپنے وطن کی ہے فضا پیشِ نظر
اک عالمِ نو ہے جا بجا پیشِ نظر
گزری ہوئی عمر پھر پلٹ کر آئی
نیرنگِ طلسمات ہے یا پیشِ نظر

جاں وقفِ الم بھی اور فرحاں بھی ہے
دل مائلِ تسکیں بھی، پریشاں بھی ہے
راولپنڈی میں آکے محرومِ حزیں
فریاد کناں بھی ہے، غزل خواں بھی ہے

اے صبحِ وطن تری صباحت ہے اور
رقصاں ہر اک کرن میں طلعت ہے اور
نظارے سے تیرے آج معلوم ہوا
صبحِ وطن اور صبحِ غربت ہے اور

راولپنڈی اور لاہور کے احباب کا ذکر جب بھی اُن کی زبان پر آیا ایک کائناتِ درد اپنے ساتھ لایا اور یہی کائناتِ درد ان کی حقیقی کائنات تھی۔ ایک نظم میں کہتے ہیں:

اے کاش مجھ کو پھر نظر آئے وہ سرزمیں
صحرا بھی جس کے صحنِ گلستاں سے کم نہیں
آغاز تھا جہاں مرا انجام ہو وہیں
اتنا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں
سودائے خام ایک غریب الدّیار کا

لیکن احبابِ پاکستان کے ساتھ اُن کی خط و کتابت زیادہ نہیں رہی۔ اس لیے کہ باقاعدہ خط و کتابت اُن کے مزاج میں نہیں تھی ہاں تخلیقِ شعر سے وہ کبھی غافل نہیں رہے اور یہ سلسلہ آخری دنوں تک قائم رہا۔ اپنے کلام کو کتابی صورت میں مرتب کرنے کی طرف بھی انھوں نے زیادہ توجہ تقسیم ہند کے بعد ہی کی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ان کے دو مجموعے شائع ہوئے تھے "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محروم" (کلامِ محروم حصہ اول، دوم، سوم اور مہرشی درشن کے علاوہ) ۱۹۴۷ء کے بعد "گنجِ معانی" اور "رباعیاتِ محروم" کے نئے ایڈیشنوں کے علاوہ کاروانِ وطن، بہارِ طفلی، شعلۂ نوا، نیرنگِ معانی، اور بچوں کی دنیا، شائع ہوئیں۔ آخر الذکر ۱۹۶۴ء میں چھپی اور اس پر حکومت ہند نے ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔

(۷)

۱۹۶۲ء میں والد محترم کو ریاح کی تکلیف شروع ہوئی جو آخر تک ساتھ رہی۔ اگرچہ انھوں نے علاج اور غذا کی باقاعدگی سے اس بیماری کا مقابلہ کیا لیکن آخری دو ڈھائی برس میں وہ پوری طرح صحت یاب نہیں رہے کبھی صحت اچھی رہی کبھی ریاحی تکلیف کے غلبے سے پریشان رہے۔ لیکن ان کی زندگی میں جو باقاعدگی اور ضابطہ اپنے بچپن سے میں دیکھ رہا تھا وہ اس وقت بھی موجود تھا۔

علاج معالجے سے یہ تکلیف عارضی طور پر رفع ہو جاتی تھی لیکن مستقل طور پر اس سے نجات انھیں نہ ملی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ دل کا مرض نہ ہو لیکن ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹروں اور یونانی اور آیورویدک اطباء کی رائے یہی تھی کہ انھیں دل کا مرض نہیں بلکہ ریاح کا مرض ہے۔ چونکہ آثار دونوں امراض کے ایک سے ہوتے ہیں، اس لیے جب ریاحی مرض کی شدت ہوتی تھی، تو انھیں گمان یہی ہوتا تھا کہ دل کا مرض پریشان کر رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک علاج کی غرض سے وہ غالباً تین بار تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے ولنگڈن نرسنگ ہوم میں بھی رہے۔ وہ ولنگڈن نرسنگ ہوم کے طریقِ علاج سے بھی مطمئن تھے اور ڈاکٹروں کے حسنِ سلوک سے بھی۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں حکیم عبدالحمید، حکیم ذکی احمد، حکیم گنگا رام گاندھی اور دید بھشناگر بھی ان کا علاج کرتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کے آخر میں جب وہ بیمار ہوئے تو ایلوپیتھک علاج ہی شروع ہوا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چنانچہ کچھ مدت تک گھر میں علاج کرانے کے بعد انھیں ڈاکٹروں ہی کے مشورے سے ولنگڈن نرسنگ ہوم

میں داخل کرا دیا گیا وہاں اچھے سے اچھے علاج کے باوجود روز ان کی صحت گرتی گئی اور ایک مہینہ چھ دن کی مسلسل علالت کے بعد ۱۶ جنوری ۱۹۶۶ء کو وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

ع ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

(۸)

میں نے ابھی تک اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔ لیکن اتنا لکھنا مضمون کے احاطے سے باہر بھی نہ ہوگا کہ والد ابھی اسکول کے تیسرے درجے ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انھیں پڑھ کر خود بخود اسی بحر میں مصرعے موزوں ہونے لگے۔ بعد میں درسی کتابوں کی نظمیں پڑھ کر واقفیت بڑھنے لگی۔ اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درس طلبہ اور ماسٹر صاحبان کے لیے دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء میں جب کہ وہ ساتویں درجے میں تھے انھوں نے آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اس شعر پر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے جو ایک دہلوی بزرگ تھے، بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے۔

الٰہی تری مہربانی ہوئی کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

اگرچہ اس دور کی شاعری ابتدائی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث زبان کے نقائص سے خالی نہ تھی لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہو گیا۔ اور دسویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی ہو گئیں جو "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور ایسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ "چڑیا کی زاری" اور "سندھ کو پیغام" مطبوعہ "مخزن" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ منشی دیا نارائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہو گئی، اور انھوں نے تعریفی جملوں سے ہر نظم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ فنِ عروض سے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال

بیٹھ گیا تھا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے اِسے حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے دامن چھڑا لیا ؎

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا | بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر | مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے متعلق بعد میں ان کی رائے یہ تھی کہ یہ میری سہل انگاری تھی، ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔

عروض کے متعلق ان کی ایک بار علامہ اقبال سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں علامہ کی رائے کا انھوں نے مجھ سے اکثر ذکر کیا۔ علامہ اقبال نے ان سے کہا تھا کہ میں نے تو عروض کی سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ ویسے شاعری کے لیے عروض جاننے کی ضرورت نہیں۔ ہاں استادی شاگردی کے سلسلے کے لیے عروض کا جاننا ضروری ہے۔

والد استادی شاگردی کے سلسلے سے بالکل بے نیاز رہے۔ شعر میں ان کا کوئی استاد ہے نہ انھوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک استثنا موجود ہے اور وہ استثنا ہے خوش فکر شاعر جے منی سرشار کی۔ ان کے علاوہ کسی نے مشورہ مانگا تو بخوشی دے دیا۔ انھیں ہند و پاکستان کے گوشے گوشے سے اس مضمون کے خطوط اکثر آتے رہتے تھے کہ میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ آپ جواب میں یہی لکھتے تھے کہ مطالعہ اور مشق جاری رکھیے۔ جوہر ہوگا تو چمک اٹھے گا۔ اصلاح لینے سے کچھ نہ ہوگا۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کو بعض کتابوں کے نام مطالعے کے لیے تجویز کرتے تھے جن میں "بانگ درا"، "جامِ سرور"، "کلیاتِ داغ" اور "کلیات امیر مینائی" کے نام ضرور شامل ہوتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ اول الذکر دو کتابیں خیالات میں تنوع اور بلندی پیدا کرنے کے لیے اور آخر الذکر صفائی زبان کے لیے بہت مفید ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطور فن حاصل کیا اور نہ اس پر فنی نظر سے توجہ کی۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

شاعر ہوں شاعری میں استاد نہیں | گو نقدِ سخن ہے پاس نقاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو | مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے۔ جب طبیعت مجبور کرتی تھی یا کوئی خارجی تحریک

رونما ہوتی تھی تو آپ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بار آپ جو کچھ لکھ لیتے تھے وہ اس کی قطعی صورت ہوتی تھی۔ میں نے انھیں کلام پر نظرِ ثانی کرتے نہیں دیکھا۔ گھر میں بچوں کا شور ہو یا غل غپاڑہ ہو۔ آپ کی شعر گوئی کے رستے میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ہاں کوئی فرمائشی نظم کہنا ہو تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ "اہتمام" ضروری ہو جاتا تھا۔ اکثر آپ کاغذ پنسل لے کر گھر سے دور شہر کے باہر چلے جاتے تھے، اور وہیں سے فرمائشی نظم ختم کر کے لاتے تھے۔ دہلی میں تو فرمائشی نظمیں کہنے کی انھیں ضرورت نہیں رہی لیکن جب کلور کوٹ اور راولپنڈی میں ہیڈ ماسٹر تھے تو ڈسٹرکٹ انسپکٹروں اور ڈپٹی کمشنروں کی فرمائشوں پر اکثر اس قسم کی نظمیں کہنا پڑتی تھیں۔ بعض دفعہ تو آپ اس قسم کی نظمیں قلم برداشتہ "لکھ" دیتے تھے۔ اس کی نقل افسر موصوف کو بھیجی اور اصل کہیں پھینک دی۔ میں ان نظموں کی نقلیں کبھی کبھار محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت ان نقلوں کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ مقالہ یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے اور کتابوں، بیاضوں یا کاغذات سے اشعار نقل کرنے سے اس کی نوعیت بدل جائے گی۔

کلور کوٹ ہی کے زمانے کی بات ہے، ایک دفعہ دریائے سندھ کے سیلاب نے ضلع میانوالی کے کچا رطاس دریا کے دیہات) کو برباد کر دیا۔ ملک زماں مہدی خاں ضلعے کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایس۔ ڈی۔ او۔ رستم کیانی صاحب تھے۔ طوفان زدہ لوگوں کی امداد کا کام ان افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک فیروز خاں نون وزیرِ تعلیم تھے وہ امداد کے انتظام کا معائنہ کرنے اور تباہ شدہ لوگوں کی ڈھارس بندھانے آئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز نے والد کو نظم کہنے کی "فرمائش" کی۔ آپ نے فی البدیہہ نظم کہی۔ چند شعر سنئے ؎

خستہ جاناں را اماں آید ہمی — مرہمِ زخمِ نہاں آید ہمی

مژدہ باد اے دل کہ دورانِ بہار — بعدِ ایامِ خزاں آید ہمی

در ہوائش بر فشاں کشتیم باز — یادِ عہدِ آشیاں آید ہمی

از سرِ ما شورشِ طوفاں گزشت — پر سکوں دورِ زماں آید ہمی

ساحلِ امید ما نزدیک شد — در نظر از وے نشاں آید ہمی

از پئے امدادِ طوفاں دیدگاں — کشتیِ امن و اماں آید ہمی

کارِ عیسیٰ چوں زماں مہدی کند — از حوادث کے زیاں آید ہمی

ما نمی ترسیم از دشتِ بلا — رستمِ ما از کیاں آید ہمی

از ستم ہائے فلک ما را چہ غم — چوں ملک فیروز خاں آید ہمی

ملک فیروز خاں نون کے نام کا ایک سجع بھی لکھا تھا ؎

مئے فیروزیش درجام کردند

ازاں فیروز خانش نام کردند

شاعرانہ صلاحیتوں کا بہ امرِ مجبوری کتنا افسوسناک استعمال ہوتا رہا! میرا خیال ہے سر فیروز خاں نون اس شعر کے معنی بھی نہ سمجھ پائے ہوں گے۔

فی البدیہہ شاعری کا ذکر آگیا ہے تو دو ایک واقعات اور بھی سن لیجیے۔ اس فن میں آپ کو واقعی ایک کمال حاصل تھا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری سے آپ کے دوستانہ مراسم تھے۔ آپ جب کبھی لاہور آتے حفیظ صاحب سے ضرور ملتے تھے۔ حفیظ صاحب بھی جب کبھی راولپنڈی گئے اپنی مشاعرانہ مصروفیات کے باوجود والد سے ملنے ہمارے گھر ضرور آئے۔ ایک دفعہ والد لاہور آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ حفیظ صاحب نے انارکلی میں بالائی منزل پر دفتر لے لیا ہے۔ آپ وہاں پہنچے تو حفیظ صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے۔ آپ نے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ شعر لکھے اور پرزہ ان کی میز پر چھوڑ کر آگئے۔

دفتر جو بالاخانے پہ دیکھا حفیظ کا — محروم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا

رونق ہوئی انارکلی کی چہار چند — بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا

جن منزلوں پہ حسن کبھی جلوہ ریز تھا — اب عشق ان میں مائلِ فریاد ہو گیا

۱۹۳۴ء کا ذکر ہے، راولپنڈی میں انجمن اسلامیہ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا والد بھی شریکِ بزم تھے۔ حفیظ اپنی نظم پڑھ چکے تو والد نے کہا ؎

حفیظِ خوش نوا بزمِ سخن میں — قیامت تک رہے گی یاد تیری

نشاط آگیں ترے نغماتِ رنگیں — غم افزائے جہاں فریاد تیری

کیا پابندِ نَے نالے کو تو نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری

اسی جلسے میں حفیظ صاحب نے منتظمین کی فرمائش پر چندے کی اپیل کی اور اپنی نظم "مسدسِ حال" پڑھی جس کے اس وقت کہیں کہیں سے مصرعے مجھے یاد ہیں ؎

مرے شیخ ہیں شیخ سر عبدِ قادر — زمانے میں اب ایسے انساں ہیں نادر

ہوا ان کی جانب سے فرماں یہ صادر — نہیں چاہتے ہم سخن کے نوادر

ہے مطلوب ہم کو نہ گریہ نہ خندہ

سنا نظم ایسی ملے جس سے چندہ

مسدس بہت طویل تھا اور پھر بزبان حفیظ، حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ چندہ بھی خاصا جمع ہوا اور وعدے تو ہزاروں تک پہنچ گئے۔ جب چندہ بازی کی افراتفری ختم ہوئی تو والد نے صدرِ بزم قبلہ شیخ سر عبدالقادر سے جو ان کے قریب تشریف فرما تھے مخاطب ہو کر کہا ؎

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو بندہ نواز
بنا ہے گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور یہ شعر حفیظ صاحب کو سنایا۔ حفیظ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے اور قبلہ شیخ صاحب نے اسی چندے کے موضوع پر اکبر الہ آبادی کے متعدد اشعار سنا دیئے۔

اجلاس تھوڑی دیر کے لیے برخاست ہوا۔ غالباً نماز کے لیے۔ حفیظ صاحب نے اعلان کر دیا کہ حضرات! جناب محروم دوسری نشست میں بھی اپنا کلام سنائیں گے۔ والد کے پاس دوسری نشست کے لیے کوئی نظم نہ تھی۔ وقت بھی بہت کم تھا لیکن چونکہ اعلان ہو چکا تھا انھوں نے کاغذ پنسل لے کر نظم کہنا شروع کر دی اور جب تھوڑی دیر کے بعد ان سے کلام سنانے کے لیے کہا گیا تو یہ اشعار ان کی زبان پر تھے ؎

اے ملتِ اسلام! ترے ذوقِ سخن سے
فردوسِ نظر عالمِ معنی کا ہے گلزار

ہر سرو یہاں مصرعِ برجستہ ہے گویا
اشجار سے پیدا ہے ترے عالمِ اشعار

مستانہ کسی کنج میں عاشق ہیں نواسنج
عارف ہیں کہیں نغمہ سرا بادلِ ہشیار

ہیں فلسفی اک سمت خراماں روشوں پر
داماںِ ترنم میں لیے گوہرِ افکار

جھلکی نظر آتی ہے یہاں حسنِ ازل کی
کتنا متجلی ہوا آئینۂ گفتار

اعجاز سے کچھ کم نہیں یہ نطق کا جادو
بے پردہ ہوئے جاتے ہیں خود روح کے اسرار

تبریزی و رومی کی نواؤں سے ہے پیہم
وہ حسن کی بارش کہ ہے جاں مطلعِ انوار

ہے روحِ بشر اس کے تجسس میں ازل سے
جس حسن کے ہیں پردہ کشا جامی و عطار

نغموں سے ہے لبریز ہوا تیرے چمن کی
کتنی ہے دل آویز فضا تیرے چمن کی

وقار انبالوی کے ساتھ ان کے مراسم بے تکلفی کی حد تک دوستانہ تھے۔ وقار صاحب پہلے "پرتاپ" میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے "احسان" میں آ گئے۔ والد کی ان سے لاہور

میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ؎

جس دن سے ادھر سے تو ادھر آیا ہے | چشمِ بینا کو کم نظر آیا ہے
"احسان" یہ بھی احساں تھا ضروری لیکن | "پرتاپ" کو بے وقار کر آیا ہے

یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، وقار صاحب نے یونہی باتوں میں ان سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آرہا ہے۔ والد ایک آدھ منٹ تک خاموش رہے پھر بولے ؎

ہو لاکھ نئے خودی سے ہٹلر سرمست | ہوجائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہوجائے گی | کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر شاعر ایڈیٹر۔ ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقار نے فوراً یہ رباعی لکھ لی اور اگلے دن اپنے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کردی۔

اسی سفر لاہور کا ذکر ہے وقار اور والد اکٹھے جارہے تھے، دیواروں پر جابجا سینما کے پوسٹر نظر آئے۔ ان پر وہی عام تصویریں تھیں، نیم عریاں۔ وقار نے تصویروں کی جانب اشارہ کیا، اور کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ والد نے جواب میں کہا ؎

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر! | آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں
خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا | منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

سینما دیکھنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے زندگی بھر میں آپ نے دو چار تصویریں ہی دیکھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بھی جہاں تک اخلاقیات کے عام اصولوں کا تعلق ہے آپ صرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہی نہیں رہے بلکہ بقول مولانا عبدالمجید سالک "ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلّمِ اخلاق رہے ہیں"۔ ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی مجھے ایک باقاعدگی اور ضابطہ نظر آیا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا۔ انھیں صبح کے ناشتے میں دودھ کے ایک گلاس کے سوا کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ ان کا یہ طریقہ ہمیشہ جاری رہا۔ گھر پر تو اس معمول میں تبدیلی ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ سفر میں ہوں تو بھی کوشش یہی رہتی تھی کہ اس میں بے قاعدگی نہ ہو۔ چائے یا لسّی سے انھیں کوئی رغبت نہیں تھی۔ لسّی تو جو ہم اہلِ پنجاب کی "قومی" غذا ہے۔ وہ بالکل استعمال نہیں کرتے تھے۔ چائے کے لیے روز ابر کا ہونا شرط تھا۔ دودھ کے بعد پھلوں کا نمبر آتا تھا اور پھل کے بارے میں اس قدر "احتیاط" سے کام لیتے تھے کہ پھل بالکل بے ذائقہ ہوکر رہ جاتا تھا۔ ان کے نزدیک پھلوں کا چھلکا بہت

مضر چیز تھی۔ اس سے پرہیز لازمی تھا۔ چنانچہ اس اصول کے تحت وہ انگور تک کا چھلکا اتار لیتے تھے۔ گھر کے باقی لوگوں کو انگور کھانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہیں تھا۔ اکثر اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ جہاں تک انگور کا تعلق ہے وہ اسے چھیلنا ترک کر دیں، لیکن وہ اپنی وضع پر قائم رہے

صحت کے پیش نظر وہ ٹماٹر بھی اکثر استعمال کرتے تھے اور اس کا بھی چھلکا اتار دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ چھلکا اتار لینے کے بعد ٹماٹر میں کیا باقی رہ جاتا ہوگا۔ شاید انھی باقاعدگیوں کا اثر تھا کہ صحت ان کی اچھی رہی لیکن بعض عارضے ایک زمانے سے ان کے ساتھ رہے۔ لڑکپن میں جب تیراکی کا شوق تھا تو دریائے سندھ میں ایک بار گہری چھلانگ لگائی۔ شوق تو پورا ہوگیا لیکن "ہرنیا" مستقل طور پر زندگی کا رفیق بن گیا۔ یہ اور اس کے ساتھ عرق النسا، دونوں کبھی کبھی بڑی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتے تھے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ دوائیں آپ کی ہر لحظہ کی ساتھی رہیں۔ باہر کہیں سفر پر جاتے تھے تو دس بارہ دوائیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے اس کے علاوہ نمک، مرچ اور چینی وغیرہ شیشیوں میں بند کر کے الگ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مشاعرے میں کہیں جاتے تو تمام شعراء کے لیے ان کی دواؤں کی میز حیرت کا باعث ہوتی تھی۔ دوائیں ساتھ لے کر ان کی سفر کی عادت شعرا میں خاصی شہرت یاب تھی۔ ایک دفعہ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ قتیل شفائی والد سے ملنے آئے، جہاں شعراء کا قیام تھا وہاں دو چار کمروں میں وہ گئے۔ والد موجود نہیں تھے۔ ایک کمرے میں میز پر مختلف دواؤں کی دس پندرہ شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ ان کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہی کمرہ والد کا تھا۔

اتفاق کی بات ہے اسی مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سامعین کا ہجوم دیکھ کر بے ہوش ہوگئے۔ رات کا ڈیڑھ بجے کا وقت تھا، ہم لوگ ان کو بڑی مشکل سے قیام گاہ تک لے آئے۔ والد کے پاس "امرت دھارا" موجود تھی، اس وقت وہ کام آئی اور شاعر صاحب اگلی صبح اچھے بھلے ہو کر رات کے مشاعرے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ایک نسل، ان کا کلام پڑھتی چلی آرہی تھی۔ اس لیے ان کی عمر کے بارے میں اکثر غلط اندازے موجود تھے۔ ایک بار جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد ان سے ملنے گئے۔ انھوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اب آپ بمشکل لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ

حیرت انگیز طور پر غلط تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے اور اس کے بعد بھی جب کہ والد کی عمر قریباً ستر برس کی تھی وہ عصائے پیری کا سہارا لیے بغیر باقاعدہ کالج جاتے تھے اور اس چھڑی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے جو چند برس پہلے ان کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی۔

والد کی شاعری کے سلسلے میں جب میں نے سینما اور سینما کے پوسٹروں کے تعلق سے ان کی فی البدیہہ شاعری کا ذکر کیا تو بات کا رخ بدل گیا اور ایک اہم بات معرضِ تحریر میں آنے سے رہ گئی۔ وہ اہم بات ہے علامہ اقبال کے انتقال پر ان کا تاثر۔ علامہ اقبال کا مرثیہ بھی انھوں نے اقبال کے انتقال کی خبر سنتے ہی فی البدیہہ کہا تھا۔ علامہ کی وفات کی خبر ریڈیو پر آئی تو انھوں نے اسی وقت مرحوم کے اعزاز میں اسکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آئے۔ مجھے بتایا کہ اب اقبال اس دنیا میں نہیں۔ پھر فرمایا دو ایک شعر میں لکھواتا ہوں تم لکھ لو۔ میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی۔ آپ حقے کے ہر کش پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ نوحے کا پہلا شعر یہ ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا — احساس میں سما گیا، دل میں اتر گیا

جب آپ یہ اشعار لکھوا چکے

کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر — قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا

کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا — ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا

باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا — باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا

خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں — خورشید جلوہ بار سے پوچھ کدھر گیا

"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق" — روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا

تو میں نے کہا کہ اس نظم میں آپ "مر گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے؟ کہنے لگے کیوں؟ میں خاموش ہو گیا، میرا خیال تھا کہ "مر گیا" کا قافیہ شعر کو بے جان کر دے گا۔ انھوں نے آخری شعر لکھوایا

محرم! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو — یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں کس قدر غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آگئی کہ وہ ہال ہم لوگوں کو نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا۔ اسے ملتوی کرنا ہمارے بس میں

نہ تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب میونسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام مدعوئین کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والد بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے مقامِ جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن

ماتمِ اقبال باید کرد در صحنِ چمن

بدیہہ گوئی کا جو ملکہ انھیں حاصل تھا اسے دیکھ کر اردو اور فارسی کے کلاسیکی شعراء کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ انتقال سے دو دن قبل ایک مقامی ماہنامے کے مدیر اُن کی عیادت کو آئے اور ان سے تازہ کلام کی فرمائش کی۔ آپ نے دو ایک منٹ توقف کیا اور یہ شعر انھیں لکھوا دیا

مرحوم آج عالمِ فانی سے چل بسا

مانگو یہی دعا کہ خدا مغفرت کرے

یہ ان کا آخری شعر ہے اور اس کے ساتھ ہی اردو شاعری کا وہ باب ختم ہو گیا جو اس صدی کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس سے برصغیر ہند و پاک کی دو نسلوں نے روشنی بھی حاصل کی تھی اور گرمی بھی۔

مصنّف کی دوسری تصنیفات اور تالیفات

شعری مجموعے :

بیکراں، ستاروں سے ذرّوں تک، وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں، انتخابِ کلام (انجمنِ ترقّی اردو ہند) کہکشاں (پاکٹ بک سیریز) بچّوں کی نظمیں، بچّوں کا اقبال (تالیف)

طویل نظمیں :

اردو، ابوالکلام آزاد، ماتمِ نہرو، شاعر کی آواز، اجنتا، دہلی کی جامع مسجد، رفیع صاحب کے مزار پر۔

نثر :

تلوک چند محروم (تالیف) اقبال اور اس کا عہد، اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال اور کشمیر، مرقعِ اقبال، اقبال کی کہانی (نو سے چودہ برس کے طلبہ کے لیے) اقبال زندگی شخصیت اور شاعری (چودہ سے اٹھارہ برس کے طلبہ کے لیے) ریڈیو فیچر (بچّوں کے لیے) میرے گزشتہ روز و شب (سوانح حیات) جنوبی ہند میں دو ہفتے (سفرنامہ)

زیرِ طباعت :

فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو (تالیف) ترجمۂ جاوید نامہ، حیاتِ محروم، اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ (انگریزی) حیاتِ اقبال، پشکن کے دیس میں۔

مرتب شدہ شعری مجموعے :

گنجِ معانی (دوسرا ایڈیشن۔ محروم) رباعیاتِ محروم (تیسرا ایڈیشن۔ محروم) نیرنگِ معانی (دوسرا ایڈیشن۔ محروم) شعلۂ نوا (دوسرا ایڈیشن۔ محروم) کاروانِ وطن (محروم) بہارِ طفلی (محروم) بچّوں کی دنیا (دوسرا ایڈیشن۔ محروم)

جگن ناتھ آزاد کے متعلق کتابیں :

جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری (اردو) حمیدہ سلطان احمد

جگن ناتھ آزاد (ہندی) پرکاش پنڈت

جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ (اردو) محمد ایوب واقف

ہماری دیگر مطبوعات

آگ (ناول)	جمنا داس اختر	5/0
آواز کا جسم (شاعری)	مخمور سعیدی	10/0
اڑان (شاعری)	شباب للت	6/0
امرائی (شاعری)	بدیع الزماں خاور	10/-
انتظار کی رات (شاعری)	کمار پاشی	8/0
انسانی حقوق کیا ہیں؟	موریس کرانسٹن	7/0
بسمل سعیدی ـ شخص اور شاعر	گوپال متل / مخمور سعیدی	18/0
بردہ فروش (ناول)	جمنا داس اختر	5/0
برگ سبز (شاعری)	آزاد نوحی	10/-
بھیگا ہوا کاغذ (شاعری)	ممتاز راشد	10/-
بند کواڑ (افسانے)	نریندر لوتھر	5/-
بے وفا (ناول)	نریندر شرما	6/-
تکون کا کرب (شاعری)	آزاد گلاٹی	5/-
تیشۂ نظر (مضامین)	ابوالفیض سحر	8/0
حساب رنگ (شاعری)	بانی	15/-
حماقت (ناول)	کہر لدھیانوی	6/-
حصار آب (شاعری)	حیات لکھنوی	10/0
خرابہ (شاعری)	من موہن تلخ	10/-
دیپک راگ (شاعری)	مظفر حنفی	6/-
روبرو (شاعری)	کمار پاشی	10/0
راکھ (شاعری)	احتشام اختر	6/0
سکھاردونے کہا	آنتری ۔ ڈی ۔ سکھادودھ	7/-
سبیل (شاعری)	بدیع الزماں خاور	10/-
حروف (شاعری)	بدیع الزماں خاور	2/50
شہر خوشبو (شاعری)	نور تقی نور	5/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
شیرازہ (شاعری)	مرتبین: مخمور سعیدی، گوپال متل	۱۸/-
شیرازۂ مژگاں (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/-
صحرا کی پیاس (شاعری)	شباب للت	۶/-
صریرِ خامہ (شاعری)	مظفر حنفی	۶/-
کفرستان (شاعری)	کرشن موہن	۲۰/-
کلیاتِ اختر شیرانی	مرتب، گوپال متل	۱۰/-
کلیاتِ شاد عارفی	مرتب: مظفر حنفی	۳۰/-
کوئے ملامت (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/-
گیان مارگ کی نظمیں (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/-
لال قلعہ (ناول)	صفدر آہ	۸/-
لفظوں کا پیرہن (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۷/-
لبِ منصور (شاعری)	دھرم سروپ	۹/-
سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں	جیوفرو ہیلر	۵/-
منتخب شاعری ۱۹۷۱ء	کمار پاشی، پریم گوپال متل	۴/-
منتخب افسانے ۱۹۶۸ء	شہباز حسین، بدیع الزماں	۱۰/-
نام بہ نام (شاعری)	رضا نقوی واہی	۶/-
نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے)	فیاض رفعت	۱۰/-
نگاہِ شوق (شاعری)	دھرم سروپ	۱۰/-
ولاس یاترا (طویل نظم)	کمار پاشی	۱۰/-

ہماری زیرِ طبع کتابیں

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
میراجی ـــ شخصیت اور فن	مرتب: کمار پاشی	۴۰/-
ن۔م راشد ـــ شخصیت اور فن	مرتب: ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر شہریار	۴۰/-
اے پیارے لوگو (تنقیدی مضامین)	وارث علوی	۲۰/-
گوری چٹی دھوپ (افسانے)	کشمیری لال ذاکر	
کنور سین کے افسانے	کنور سین	

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
شیرازہ (شاعری)	مرتبین: مخمور سعیدی، گوپال متل	۱۸/۰
شیرازۂ مژگاں (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/۰
صحرا کی پیاس (شاعری)	شباب للت	۶/۰
صریرِ خامہ (شاعری)	مظفر حنفی	۶/۰
کفرستان (شاعری)	کرشن موہن	۲۰/۰
کلیاتِ اختر شیرانی	مرتب، گوپال متل	۱۰/۰
کلیاتِ شاد عارفی	مرتب: مظفر حنفی	۳۰/۰
کوئے ملامت (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/۰
گیان مارگ کی نظمیں (شاعری)	کرشن موہن	۱۰/۰
لال قلعہ (ناول)	صفدر آہ	۸/۰
لفظوں کا پیرہن (شاعری)	بدیع الزماں خاور	۷/۰
لبِ منصور (شاعری)	دھرم سروپ	۹/۰
سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں	جیوفری وہیلر	۵/۰
منتخب شاعری ۱۹۷۱ء	کمار پاشی، پریم گوپال متل	۴/۰
منتخب افسانے ۱۹۶۸ء	شہباز حسین، بدیع الزماں	۱۰/۰
نام بہ نام (شاعری)	رضا نقوی واہی	۶/۰
نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے)	فیاض رفعت	۱۰/۰
نگاہِ شوق (شاعری)	دھرم سروپ	۱۰/۰
ولاس یاترا (طویل نظم)	کمار پاشی	۱۰/۰

ہماری زیرِ طبع کتابیں

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
میراجی — شخصیت اور فن	مرتب: کمار پاشی	۴۰/۰
ن۔م راشد — شخصیت اور فن	مرتب: ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر شہریار	۴۰/۰
اے پیارے لوگو (تنقیدی مضامین)	وارث علوی	۲۰/۰
گوری چٹی دھوپ (افسانے)	کشمیری لال ذاکر	
کنور سین کے افسانے	کنور سین	

موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲